انتظارِ فصلِ گُل

نگہت عبداللہ



نام کتاب	انتظارِ فصلِ گل
مرتبہ	نگہت عبداللہ
اہتمام	سیّد فرحان زیدی
ٹائٹل ڈیزائن	محمد عامر (طاہر سنز آرٹ سیکشن)
کمپوزنگ	عاصم شہزاد (طاہر سنز آرٹ سیکشن)
ناشر	طاہر سنز 40/B اُردو بازار، لاہور فون: 7234137-7312159
مطبع	عمران یوسف پریس بندروڈ لاہور
قیمت	-/150 روپے

ڈسٹری بیوٹرز

1) اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک، راولپنڈی فون:051-5531610-5774682

اسٹاکسٹ

1) ویلکم بک پورٹ مین اُردو بازار، کراچی فون:021-2633151-2639581

2) کتاب گھر کمیٹی چوک، راولپنڈی فون:051-5552929-5539380

انتساب

اپنے پیارے

ماں باپ

کے نام

انتظارِ فصلِ گل

رات اندھیری اور راستہ دشوار گزار، پھر بھی خضر حیات گھوڑے کو سرپٹ دوڑائے جا رہا تھا۔ اس گہری خاموش رات میں اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز خاموشی کا سینہ چیرتی ہوئی لگ رہی تھی۔ گو کہ اور کسی آواز کا نہ شائبہ تھا نہ امکان، پھر بھی ذرا سی آہٹ جو یقیناً اس کا وہم ہوتی، پر وہ مزید چوکنا ہو جاتا اور پھر فوراً اپنے پیچھے اور پھر دائیں بائیں گردن گھما کر دیکھتا۔

وہ بزدل نہیں تھا اگر دشمنوں میں سے دس اس کے سامنے آ کھڑے ہوتے تو وہ اکیلا ہی مقابلے کے لئے ڈٹ جاتا لیکن اسے خطرہ صرف پیچھے سے وار کا تھا۔ اس لئے اس کا زیادہ دھیان اپنے پیچھے تھا اور وہ گاہے بگاہے گردن موڑ کر پیچھے دیکھتا اور اطمینان کر لینے کے بعد گھوڑے کو اور تیز دوڑانے لگتا۔

یہ وہ وقت تھا جب پاکستان بننے کا پر مسرت اعلان مسلمانوں کے اندر ایک نیا جوش ولولہ پیدا کر گیا اور ایک آزاد مملکت میں سانس لینے کی آرزو میں اکثریت اپنا مال و اسباب چھوڑ کر پاکستان کی طرف ہجرت کرنے لگی۔ خضر حیات کا خاندان بھی آج رات سفر کر رہا تھا۔ سفر کے ابتدائی مرحلے میں تو خضر حیات ان کے ساتھ رہا۔ لیکن پھر اسے جانے کیا خیال آیا کہ اس نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اور یہ خیال تھا راجیش کمار سے ملنے کا اور اس پر وقار سی لڑکی کو آخری بار دیکھنے کا جو راجیش کی بہن تھی۔

پوجا اپنے نام کی خصوصیت لئے ہوئے کہ مقابل اسے دیکھتے ہی بے اختیار ہاتھ باندھ کر سر جھکا جائے اور یہ حرکت بالکل غیر ارادی طور پر بارہا خضر سے بھی سرزد ہو چکی تھی۔ گو کہ دونوں ندی کے ایسے کنارے تھے جو ساتھ ساتھ چل تو سکتے ہیں لیکن جن کا ملن ناممکنات میں سے ہے اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے۔

راجیش سے اس کی دوستی اسکول کے زمانے میں ہوئی تھی اور گزرتے وقت نے ان دونوں کو ایک مضبوط ڈوری میں باندھ دیا تھا۔ ایسی مضبوط ڈوری جسے بدلتے حالات بھی توڑنے میں ناکام

رہے تھے۔ راجیش ساتھ والے گاؤں میں رہتا تھا اور اکثر اس کے پاس آ بھی جاتا تھا اور یہ بھی جب موقع ملتا اس کی طرف نکل جاتا تھا۔ شروع شروع میں اس کی آمد و رفت صرف مہمان خانے تک محدود رہی پھر جب دوستی کی بنیادیں مضبوط ہو کر دونوں کو یک جان دو قالب میں ڈھال گئیں تب راجیش کے ماتا جی اور پتا جی بھی اس پر بھرپور اعتماد کرنے لگے۔ اور وہ ان کے گھر کے فرد کی سی حیثیت اختیار کرتا گیا۔ اور جب ان کے گھر بلا جھجک آنا جانا شروع ہوا۔ تب اس نے پوجا کو دیکھا تھا۔ سروقد۔ مقابل کو تسخیر کر لینے والی آنکھیں، ستواں ناک، قدرے بھرے بھرے ہونٹ، سلونی شاموں کا روپ چرائے جب وہ پہلی بار اس کے سامنے آئی تو وہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ اسے یاد آیا وہ پہلی ملاقات کا منظر۔

"سلام......!" اس نے ہاتھ باندھتے ہوئے سر کو ذرا سا خم دے کر کہا تھا۔

"نمستے......!" پوجا نے کہا۔ اس کی آواز میں جھانجھروں کی کھنک تھی، اس کے باوجود اس ایک لفظ "نمستے" نے اسے احساس دلایا کہ اس سے جتنے فاصلے پر وہ اب کھڑا ہے، صدیوں کی مسافت کے بعد بھی یہیں کھڑا رہے گا۔ اس درمیانی فاصلے کو مٹا نہیں سکے گا۔

"آپ بیٹھیے خضر بابو......! راجیش بھیا بس ابھی آتے ہی ہوں گے۔" وہ آہستہ آواز میں بولی اور وہ بہت کچھ کھو دینے کے احساس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ نظریں اس سروقد لڑکی کے قدموں میں اُلجھنے لگی تھیں۔

"چائے لاؤں آپ کے لئے......؟"

"نہیں......"

"کیوں......؟"

"راجیش آ جائے، اس کے ساتھ ہی پی لوں گا۔" اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹیکتے ہوئے براہ راست اس کی طرف دیکھا اور وہ جو بڑے اعتماد سے کھڑی تھی، پہلے پلکیں جھپکیں، پھر وہاں سے جانے کے بہانے ڈھونڈنے لگی۔ وہ خاصا محظوظ ہوا۔

"آپ کھڑی کیوں ہیں، بیٹھ جائیے ناں......" وہ اسے روکنے کی غرض سے بولا۔

"میں دیکھتی ہوں راجیش بھیا آئے کہ نہیں۔" وہ پلٹی تو جیسے گھٹا چھا گئی۔ کمر سے نیچے جاتے سیاہ بال جن میں وہ اُلجھتا چلا گیا تھا۔

"ہمارے درمیان مذہب کی خلیج حائل ہے جسے پاٹنا نہ میرے اختیار میں ہے نہ اس کے۔" اگلے کئی دن تک وہ اپنے آپ کو یہ بات سمجھاتا رہا تھا اور پھر وہ خود کو سمجھانے میں کامیاب ہو گیا۔

"ہم ندی کے دو کنارے ہیں۔" یہ ایک نہ مٹنے والا احساس تھا جو آئندہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہا جس نے اسے کبھی حد سے بڑھنے نہیں دیا۔ اور شاید وہ بھی حقیقتوں سے نظریں چرانے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ جبھی اس کے ضبط کو آزمانے یونہی بلاوجہ کبھی اس کے سامنے نہیں آئی کبھی کبھار ہی اچانک سامنا ہو جاتا تو جہاں یہ اپنی جگہ ٹھٹھک جاتا وہاں وہ بھی جھجکتی اور فوراً پلٹ جاتی تھی۔ وہ خود بھی چاہتا تھا۔

راجیش کے گھر جاتے ہوئے راستے بھر دعائیں کرتا تھا کہ اس کا سامنا نہ ہو، ایمان ڈولنے لگتا ہے۔ اور یہ ایسی دعا تھی جو ہر دو صورتوں میں اسے آزردہ ہی کر جاتی تھی۔ دعا قبول ہوتی تو وہ اس کی دید کی حسرت لئے واپس آتا اور مقبول ہونے کی صورت میں اس کے دل کا بوجھ بڑھ جاتا کہ اسے دیکھ سکتا ہے۔ چھو نہیں سکتا۔

اب جبکہ وہ ہمیشہ کے لئے یہاں سے جا رہا تھا تو راجیش سے مل کر جانا چاہتا تھا۔ گو کہ وہ پچھلے کئی دنوں سے اس کے پاس جانے کی سوچ رہا تھا۔ لیکن حالات اجازت نہیں دے رہے تھے۔ اب بھی وہ بڑی مشکل سے اماں اور ابا کو منا پایا تھا۔ اماں، ابا اور بڑے بھیا کوئی بھی اسے جانے نہیں دے رہے تھے، لیکن دوستی کا تقاضا تھا اور اندر کہیں اس سروقد لڑکی کو آخری بار دیکھنے کی شدید خواہش جسے وہ کسی طور دبا نہیں پایا تو اماں کے پیر پکڑ لئے۔

"مجھے جانے دیجئے۔ میں سرحد پر آپ سے آن ملوں گا۔" اس کے لہجے میں منت تھی اور دل کو گرفت میں لینے والی التجا۔ اماں نہ چاہتے ہوئے بھی مان گئیں۔ اور اسے اللہ کی امان میں دے کر خود اپنے سفر پر روانہ ہوئیں۔

آج وہ ہمیشہ والی دعا نہیں مانگ رہا تھا۔ بلکہ صرف ایک نظر اسے دیکھنے کی دعا تھی، جو دل سے نکل کر ہونٹوں سے چپک گئی تھی۔



گلی کوچوں میں ایک شور سا تھا۔ اتنے دنوں سے آس و یاس میں گھرے چہرے اب اچانک کھل اٹھے تھے۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد بالآخر کامیابی مقدم ہوئی تو سب ایک دوسرے کو بڑھ بڑھ کر مبارکباد دے رہے تھے۔ بچے، بوڑھے، جوان سب کی زبان پر پاکستان کا نام تھا۔ ایسے میں حق نواز اپنے چھوٹے سے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا ہر آنے جانے والے کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

پتا نہیں اس کا ذہن بیدار تھا یا نہیں۔ بس آنکھیں ہی کھلی تھیں جن میں سرخ سرخ ڈورے

تیرتے نظر آرہے تھے۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی ادھر سے گزری تو کسی نے پکار کر کہا۔

''یار حق نواز......! پتا ہے، پاکستان بن گیا ہے۔''

''اچھا......!'' اس نے یوں کہا جیسے اسے کسی بات سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

''یار......! کم از کم آج تو اپنی حالت ٹھیک رکھو۔'' ایک لڑکے نے بڑھ کر اسے گریبان سے پکڑا اور گھسیٹ کر کھڑکی سے باہر کھینچ لیا۔

''کیا...... یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ......؟'' اس کی لڑکھڑاتی آواز میں خوف سمٹ آیا تھا۔

''آؤ تمہیں شہر کی سیر کرا دیں۔ ذرا دیکھو، لوگ کس قدر جشن منا رہے ہیں'' عرفان نے اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو اس کا توازن بگڑ گیا۔

''ارے ارے......!'' ایک لڑکے نے اسے بازوؤں میں سنبھال لیا اور عرفان سے کہنے لگا۔ ''ذرا ہاتھ قابو میں رکھ کر بات کرو، بیچارے میں جان ہی کتنی ہے۔''

''معاف کرنا یار......! مجھے خیال نہیں رہا۔'' عرفان نے معذرت کی پھر کہنے لگا ''کتنے افسوس کی بات ہے، جوان جہان ہو لیکن ایسی بُری لت میں پڑ کر جوانی برباد کیے دے رہے ہو۔ بیٹا......! ابھی بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ کب تک بوڑھی ماں کے سینے کا ناسور بنے رہو گے۔''

''عرفان ٹھیک کہہ رہا ہے حق نواز......!'' عابد نے بھی اسے سمجھانا فرض سمجھا۔

''اب تمہاری ماں کے آرام کا وقت ہے، تمہیں چاہیے کہ اس کا سہارا بنو، نا کہ تم الٹا اس پر بوجھ بنے ہوئے ہو۔''

وہ خالی خالی نظروں سے ایک ایک کی صورت تکے گیا۔ پتا نہیں کوئی بات اس کی سمجھ میں آ بھی رہی تھی کہ نہیں بس سر چکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور آنکھوں کے آگے دھند چھانے لگی تھی۔

''مجھے چھوڑ دو...... مجھے چھوڑ دو۔'' اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔

''چھوڑنا مت...... گر جائے گا۔'' عرفان نے خود بڑھ کر اسے سنبھالا پھر ساتھیوں سے کہنے لگا۔ ''چلو اسے اس کی اماں کے پاس چھوڑ آئیں۔''

''چلو......!'' سب اسے لئے ہوئے اس کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ حق نواز کی بس ایک بوڑھی ماں ہی تھی۔ اس لئے اکثر لڑکے بالے بلا جھجک اس کے گھر چلے جایا کرتے تھے۔

''اماں......!'' عرفان نے دروازے میں رک کر آواز دی۔ پھر سب ایک ساتھ اندر چلے گئے۔ بیچاری بوڑھی عورت مشین پر جھکی ہوئی تھی۔ آواز پر سر اٹھا کر دیکھا پھر اپنے بیٹے پر نظر پڑی جو دوسروں کے سہارے کھڑا تھا۔

''کیا ہوا نواز کو......؟'' وہ دہل کر پوچھنے لگیں۔ گو کہ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر ہی

دوسروں کے سہارے چل کر آتا تھا۔ بلکہ اماں کو تو حسرت ہی تھی کہ کبھی وہ خود سے چل کر اس کے پاس آئے۔

''یہ نشے میں ہے۔'' عرفان نے کہا اور اسے قریب بچھی چارپائی پر لٹا دیا۔

''پتا نہیں، یہ کب سدھرے گا۔'' اماں کے لہجے میں مایوسی اور تاسف تھا۔

''اماں......! اگر اجازت دو تو ہم اسے سدھار دیں۔'' عابد کو ان کی مایوسی پر ترس آیا تو کہنے لگا۔

''کیسے سدھارو گے......؟''

''رسیوں سے باندھ کر بٹھا دیں گے اسے پھر دیکھتے ہیں یہ کیسے بری سنگت میں جاتا ہے۔''

''ہاں اماں......! بس ذرا دل پر پتھر رکھ لو۔'' عرفان نے عابد کی بات کی تائید کی۔

''بیٹا......! یہ بہت کمزور ہے۔'' اماں کا اپنا دل کمزور تھا۔

''ساری کمزوری دور ہو جائے گی۔ بس تم اسے ہمارے حوالے کر دو۔'' سب اصرار کرنے لگے کہ اسی وقت اسے لے جائیں گے، لیکن اماں رضامند نہیں ہوئیں کہنے لگیں۔

''آج...... رہنے دو، میں اسے سمجھا دیکھوں گی، اگر نہیں سمجھا تو پھر بے شک لے جانا۔''

''ٹھیک ہے...... ہم کل آ کر دیکھیں گے۔'' وہ سب ایک دوسرے کو چلنے کا اشارا کرنے لگے۔

''اچھا اماں......! ہم چلتے ہیں اگر کوئی ضرورت ہو تو آواز دے لینا۔'' عرفان نے جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔

''اللہ تم سب کو اپنی امان میں رکھے۔'' اماں دعائیں دینے لگیں۔ جنہیں اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے وہ سب چلے گئے۔

''ایک یہ ہیں اور ایک تو ہے۔'' اماں چارپائی پر بے سدھ پڑے حق نواز کو دیکھنے لگیں۔ ان کا دل دُکھ سے بھر گیا۔ ایک ہی اولاد اور وہ بھی ناسور بن کر رہ گیا تھا۔ کتنا آسرا تھا کہ جوان ہوگا تو بیوگی کے سارے دکھ سمیٹ لے گا لیکن۔ دل کا درد آنکھوں میں سمٹ آیا اور بوڑھی آنکھیں جھر جھر بہنے لگیں۔ وہ اتنی بوڑھی نہیں تھیں۔ لیکن حالات نے انہیں وقت سے پہلے ہی بڑھاپے کی دہلیز پار کرا دی تھی اور کچھ انہوں نے خود ہی مصلحتاً جوانی کا دامن جلد چھوڑ دیا تھا۔ سر پر کوئی سائبان نہ ہو تو جوانی خود اپنے لئے خطرہ بن جاتی ہے اسی لئے جس روز ان کے سیاہ بالوں والے سر کو بیوگی کی سفید چادر نے ڈھانپا اسی روز انہوں نے اپنے البیلے دور کو دفن کر دیا تھا۔ دن رات مشین پر جھک کر کمر دوہری کیا ہوئی کہ سب کی اماں بن گئیں، جگت اماں۔

سب سے پہلے پہل انہیں حق نواز کی اماں کہتے پھر جانے کیسے حق نواز پس منظر میں چلا گیا اور وہ صرف اماں رہ گئیں۔ وہ خود بھی چاہتی تھیں۔ کیونکہ جانتی تھیں کہ بقیہ زندگی عزت سے گزارنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ حق نواز آٹھویں کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ جب سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ وہ خاصا ذہین، اور نیک لڑکا تھا۔ لیکن جب راہنمائی کرنے والا ہاتھ سر پر نہ رہا تو وہ زیادہ دن تک اپنے راستے پر نہ چل سکا۔ بہت جلد تو وہ بری صحبت کا شکار نہیں ہوا تھا۔ شروع شروع میں اس نے اپنے آپ کو سمجھانے اور سنبھالنے کی بہت کوشش کی تھی۔ لیکن جب ہر راستہ ہی بے نشان ہوتا گیا۔ تب اس نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اور حالات کیا تھے۔

گھر میں اماں جو مشین سے ناتا جوڑ کر خود بھی مشین ہو گئی تھیں۔ پورا دن اور رات کا بیشتر حصہ بھی وہ مشین پر جھکے ہوئے گزارتیں۔ اس کے باوجود دو وقت کی روٹی بمشکل نصیب ہوتی تھی۔ اسکول سے دلچسپی اس وقت تک رہی، جب تک ضروریات پوری ہوتی رہیں اور جب معمولی سے معمولی چیز کا حصول بھی ناممکن نظر آنے لگا۔ تب دلچسپی آپ ہی آپ ختم ہو گئی۔ پہلے وہ سزا کے ڈر سے اسکول سے غائب ہونے لگا۔ اور پھر بالکل ہی چھوڑ دیا۔

یہیں سے اس کی بدقسمتی کی ابتدا ہوئی۔ اسکول کے بہانے گھر سے نکلتا اور سارا دن جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا رہتا تھا۔ اماں اس کی طرف سے مطمئن تھیں۔ اور اس آس میں کہ جب اپنے پیروں پر کھڑا ہو گا تو ان کے تمام دلدر سمیٹ لے گا۔ انہیں اپنی محنت کا حوصلہ مل جائے گا۔ لیکن محنت کا صلہ تو کیا ملتا وہ تو الٹا ان کے ناتواں کاندھوں کو جھکا گیا تھا۔ وہ کیا کرتا، جب کسی بھی ضرورت کے لئے اماں سے کہتا اور پھر جس طرح ان کی چہرے پر تفکرات کی لکیروں کا جال سا بن جاتا۔ وہ اسے آزردہ بھی کرتا اور آئندہ کسی ضرورت کے لئے کہنے سے روک بھی دیتا تھا۔ یونہی اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کا گلا گھونٹتے گھونٹتے وہ اس مقام پر آ گیا تھا۔

شاید کبھی کسی دن وہ کہیں بیٹھا اپنے حالات پر کڑھ رہا تھا۔ شکستگی کا احساس اس کے پورے وجود پر چھایا تھا۔ جب کسی نے اس کے پاس آ کر کہا تھا۔

"لو یار...... ! مارو دم...... مٹے غم۔"

اور پھر وہ غموں سے لڑنے کی طاقت کھو بیٹھا۔ شاید یہ راستہ زیادہ آسان تھا۔ کوئی تردد نہیں، کوئی جدوجہد نہیں بس ایک ذرا سا دھواں حلق سے نیچے اترا اور سارے غموں سے نجات مل گئی۔ کبھی جو ہوش میں ہوتا تو سوچتا کہ اماں کے چہرے کی جن لکیروں کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ گہری ہو کر اماں کو کس مقام پر کھڑا کر گئی ہیں کہ ان کا شمار نہ زندوں میں ہے نہ مردوں میں۔ اسے تو اپنا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ اماں کا خیال کیا کرتا۔

"حق نواز......!" اماں نے قریب آ کر اسے پکارا پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ دیکھ رہی تھیں کہ وہ یونہی بے حس و حرکت پڑا بس صرف آنکھیں کھولے چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ ان کے پکارنے پر بھی یونہی پڑا رہا۔

"بیٹا......! کھانا نہیں کھاؤ گے......؟" وہ ماں تھیں، مامتا سے مجبور ہو کر اس کی پیشانی پر محبت سے ہاتھ رکھ گئیں۔ اور پھر اولاد خواہ کیسی بھی ہو، ماں کا دل اس سے کبھی متنفر نہیں ہوتا۔

"بھوک نہیں ہے اماں......!" اس نے بے دلی سے جواب دے کر کروٹ بدل لی۔

"میں لے کر آتی ہوں۔ کھانا سامنے آئے گا تو بھوک بھی لگ جائے گی۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ جا کر ایک پلیٹ میں سالن اور ایک میں روٹی رکھ کر لے آئیں۔

"اٹھ کر بیٹھو...... میں تمہیں کھلا دیتی ہوں۔"

"میں بچہ تو نہیں ہوں۔ وہ ہنسا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"بڑے ہو گئے ہو کیا......؟" اس کے ایک ذرا سے ہنس دینے سے اماں کے چہرے پر رونق آ گئی۔

"ہاں......!"

"پھر تمہیں میرا احساس کیوں نہیں ہوتا۔ کیوں دکھیاری ماں کو اور دکھ دینے پر تلے ہوئے ہو۔" اماں نے اسے سمجھانے کا ارادہ کیا۔

"میں نے کیا کیا ہے اماں میں تو کچھ بھی نہیں کہتا۔" وہ سادگی سے بولا۔

"یہی تو دکھ ہے کہ تم کچھ نہیں کہتے، ہر بات اپنے تک رکھ کر اس حال کو پہنچ گئے ہو۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔ "بیٹا! تم یہ بری لت چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔"

"چھوڑ دوں گا۔" وہ سعادت مندی سے بولا۔

"کب......؟" اماں جانتی تھیں کہ وہ ہمیشہ یہی جواب دیتا ہے پھر بھی پوچھنے لگیں۔

"بس چھوڑ دوں گا۔"

"وعدہ کرو...... اب کبھی اسے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔"

"ہاں...... ہاں...... وعدہ کر رہا ہوں اور توبہ بھی۔" دونوں ہاتھوں سے کان پکڑ لیے۔

وہ پہلی بار وعدہ نہیں کر رہا تھا۔ ہمیشہ وعدہ کرتا اور بھول جاتا تھا اس کے باوجود اماں پر امید ہو گئیں۔ اس کی بات کا اعتبار کر لیا۔ یہاں تک سوچا کہ اب اسے عرفان اور عابد کے حوالے نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن اگلے دن وہ سارا دن غائب رہا۔ شام میں جب لوٹا تو اس کی وہی حالت تھی۔ پاؤں رکھتا کہیں تھا اور پڑتے کہیں تھے۔ اس کے ڈولتے قدموں کے ساتھ اماں کا دل بھی ڈولتا

گیا۔اور پھر وہ اسی وقت جا کر عرفان کو بلا لائیں۔

"لے جاؤ اسے اور جو سلوک چاہے اس کے ساتھ کرو لیکن خدا را اسے ٹھیک کر دو۔" اس کی بہتری کی خاطر بالآخر دل پر پتھر رکھ ہی لیا تھا۔

○○○

راجیش کا مکان دور سے نظر آنے لگا تھا۔خضر گھوڑے سے اُترا اور اس کی باگیں تھام کر محتاط انداز سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔جس وقت اس نے راجیش کے دروازے پر دستک دی، رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔

"کون......؟" دوسری اور پھر تیسری دستک کے بعد، راجیش کے ملازم رام کاکا کی آواز آئی تھی۔

"میں ہوں کاکا، خضر......" اس نے سرگوشی میں بتایا۔

"ارے......!" دروازہ فوراً کھل گیا۔"اس وقت کیسے آئے بابو سب خیر تو ہے ناں۔"

"ہاں کاکا......! اب خیر ہے میں راجیش سے ملنے آیا ہوں۔"

"کون ہے کاکا......!" پوجا کی آواز پر وہ فوراً رام کاکا کے پیچھے دیکھنے لگا۔اور پہلی بار وہ اپنی دُعا کے قبول ہونے پر آزردہ نہیں ہوا۔

"خضر بابو آپ اس سمے کیسے آئے۔" وہ اسے دیکھتے ہی قدرے حیرت سے پوچھنے لگی۔

"راجیش سے ملنے آیا تھا۔"

"اندر آجایئے۔"

"میں جلدی میں ہوں پوجا جی، اگر راجیش......"

"آپ اندر تو آئیں۔" اس کی بات کاٹ کر اور اپنی بات کہہ کر وہ پلٹ گئی اور وہ ناچار اس کے پیچھے چل پڑا۔

"راجیش ہے کہاں......؟" اندر آتے ہی وہ پوچھنے لگا۔

"بھیا دو روز پہلے ہی بمبئی گئے ہیں۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔اس کا مطلب ہے۔میں اس سے نہیں مل سکوں گا۔" وہ آہستہ آواز میں جیسے اپنے آپ سے بولا۔اس کے باوجود اس نے سن لیا۔اور پوچھنے لگی۔

"کیا مطلب......؟"

"اصل میں، میں پاکستان جا رہا ہوں اس لئے۔"

"کب......؟" وہ اس کی بات کاٹ کر بے تابی سے پوچھنے لگی۔

"ابھی......"

"ابھی......؟"

"ہاں......! گھر والے تو چلے گئے ہیں۔میں راستے ہی میں ادھر نکل آیا۔سوچا تھا۔آخری بار راجیش سے مل لوں گا۔"

انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو "اور تم سے بھی۔" وہ پلکوں کی جھالریں اٹھائے اسے دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

"اگر راجیش بھیا کو پتا ہوتا تو کبھی نہ جاتے۔" قدرے توقف کے بعد بولی۔"آپ بیٹھیں ناں، میں کاکا سے کہتی ہوں چائے بنا لائیں۔"

"نہیں پوجا جی......! چائے رہنے دیں، میں اسی وقت نکل جاؤں تو اچھا ہے، گھر والوں سے جا ملوں گا۔"

"کچھ دیر رک جاؤ......"

"بس کچھ دیر اور......"

اس کا ہر انداز پکار پکار کہہ رہا تھا۔لیکن لب خاموش تھے۔

یہ آنکھیں، یہ میری آنکھیں۔

پھر کہاں ڈھونڈ پائیں گی تمہیں۔

"میں چلوں......" وہ اسے گم صم کھڑے دیکھ کر کہنے لگا تو وہ چونک گئی۔پھر کہنے لگی۔

"ایک بات کہوں خضر بابو......!"

"جی......!" اس نے فقط اتنا کہا اور سوالیہ نظریں اس پر ٹکا دیں۔

"آپ کو اکیلے سفر نہیں کرنا چاہیے۔حالات بہت خراب ہیں۔"

"مجھے اندازہ ہے لیکن راجیش سے ملنے کی خواہش کو میں دبا نہ سکا۔" کاش وہ کہہ سکے تمہیں دیکھنے کی خواہش بھی شدید تھی۔

"مجھے افسوس ہے اور یقیناً راجیش بھیا کو بھی آپ سے نہ ملنے کا بہت افسوس ہوگا۔" وہ کہنے لگی۔

"اچھا میں چلوں۔" اس نے طویل سانس لے کر اس کے سراپے کو بغور دیکھا۔ایمان کے ساتھ ہستی کو بھی ڈانواں ڈول کر رہی تھی۔وہ فوراً نظریں جھکا گیا۔

"ماتا جی اور پتا جی کو میرا اسلام کہیے گا۔اس وقت انہیں اٹھانا مناسب نہیں لگتا ورنہ میں ان

سے مل لیتا۔"

وہ سر ہلاتی ہوئی اس کے ساتھ چل پڑی۔ اور ابھی دونوں بیرونی دروازے کے قریب ہی پہنچے ہی تھے کہ باہر سے شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جو بتدریج بلند ہوتی جا رہی تھیں۔

"خضر بابو......!" اس نے بے خیالی میں اس کا بازو تھام لیا۔ "ابھی مت جائیے۔"

وہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی مسحور کر لینے والی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ اور کبھی نہ سمٹنے والا فاصلہ جانے کیسے سمٹ گیا کہ اس کا لرزتا بدن اس کے بازو سے چھو رہا تھا۔

"مجھے ابھی جانا ہے...... اماں میری راہ دیکھ رہی ہوں گی۔" اسے اپنی آواز اجنبی لگی۔

"لیکن باہر بہت خطرہ ہے۔ آپ آوازیں نہیں سن رہے۔"

"ہاں......!" وہ جانے کیا سوچنے لگا کہ اس کی خوفزدہ سی سرگوشی سنائی دی۔

"خضر بابو...... ! اندر چلیں۔"

اس نے بہت آہستگی سے اپنا بازو اس کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کیا اور باہر کی طرف قدم بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ باہر کی آوازیں بہت قریب سے آنے لگیں۔

"بلونت سنگھ آج حیات محمد کے گھر والے بھی نکلے ہوں گے۔ ان کے پیچھے کسی کو بھیجا۔"

"ان کی فکر چھوڑو" ایک اور آواز آئی۔ "خضر کو ڈھونڈو۔ اسے میں نے اسی طرف آتے دیکھا تھا۔"

"اوئے زندہ نہ جانے پائے۔" کرخت آواز سنائی دی۔

"خضر بابو...... ! وہ بہت سارے ہیں اور آپ اکیلے۔" وہ سرگوشی میں کہنے لگی۔

"میں یہاں محفوظ نہیں ہوں۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ میں یہاں کس کے پاس آتا ہوں اور میری وجہ سے آپ سب۔" اس کی بات ہونٹوں میں رہ گئی۔ باہر کوئی کہہ رہا تھا۔

"راجیش کے گھر میں دیکھو...... وہیں چھپا ہوگا۔"

"خضر بابو بھگوان کے لئے۔" وہ اس کا بازو پکڑ کر کھینچتی ہوئی پچھلے آنگن میں لے گئی۔ اور وہاں سے اسے دیوار پر چڑھ کر باہر کودنے کا اشارہ کیا۔ اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ فوراً دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا اور ابھی وہ سنبھل کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ دھم کی آواز پر فوراً پلٹ کر دیکھا وہ زمین سے اٹھ رہی تھی۔

"آپ......!" وہ حیران ہوا۔

"یہ راستہ آپ کے لئے انجان ہے۔" وہ کہنے لگی۔ "اور راستہ ڈھونڈنے کا وقت نہیں ہے،

چلیے، میں آپ کو اس حد تک چھوڑ آؤں، جہاں سے قافلے روانہ ہو رہے ہیں۔"

"اس طرح تو آپ......"

"میری فکر مت کریں۔" وہ تیزی سے کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو بھاگنے لگی۔ کچی گلیاں، کبھی تنگ اور کبھی چوڑی، اس کے بعد طویل سنسان سڑک اور پھر کھیتوں کا سلسلہ وہ بھاگتے رہے بھاگتے رہے، یہاں تک کہ صبح کی سپیدی نمودار ہونے لگی۔

"پوجا......!" وہ ایک دم رک گیا۔ "اب تم لوٹ جاؤ۔"

"نہیں خضر بابو...... ! مجھے جب تک آپ کی طرف سے پورا اطمینان نہیں ہو جاتا میں نہیں جاؤں گی۔"

"میری وجہ سے اپنے آپ کو خطرے میں مت ڈالو" وہ جھنجلایا۔

"بس تھوڑی دور اور ان کھیتوں کی حد سے آگے۔"

وہ چل پڑی......اور مجبوراً اسے بھی قدم بڑھانے پڑے، پھر جیسے ہی کھیتوں کی حد ختم ہوئی، دور سے انسانی ہیولے، حرکت کرتے نظر آنے لگے۔

"میرا خیال ہے کوئی قافلہ ہے۔" وہ رک کر کہنے لگا۔ "اب تم جاؤ، وہاں تک میں خود چلا جاؤں گا۔"

"جب یہاں تک آ گئی ہوں تو تھوڑا آگے جانے میں کیا حرج ہے۔"

"تم چاہتی کیا ہو......؟" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"اپنا اطمینان......" پھر نظریں چراتے ہوئی بولی۔ "میں، دیکھنا چاہتی ہوں کہ عزیز ترین ہستی کو الوداع کہنے پر دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔"

"پوجا......!" وہ حیران ہوا۔

"ہاں خضر بابو...... ! تم مجھے اچھے لگتے ہو۔" وہ کتنی دیر تک کھڑا اس کی طرف دیکھے گیا۔ اب اس مقام پر اسے کیا کہتا کہ میرے جذبات بھی تم سے مختلف نہیں ہیں۔ اب خاموشی ہی میں بہتری تھی۔ اس لئے کہ چپ چاپ اس کا ہاتھ تھام کر اپنے قافلے کی طرف چل پڑا۔

وہ قافلہ کیا تھا، بس گنتی کے چند لوگ جو جانے کیسے بلوائیوں کی درندگی کا شکار ہونے سے بچ گئے تھے۔ اور باقی سب...... اس کی نظریں کھلے میدان میں یہاں سے وہاں تک بھٹکتی چلی گئیں۔ ایک خون کا دریا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور دوسرا اس کی آنکھوں میں اترا ہوا تھا۔

"خضر بابو...... ! ہم لٹ گئے، برباد ہو گئے۔" ایک بوڑھی فریاد۔

"خضر چاچا میری ماں کو......" معصوم سسکیاں۔

وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھنے لگا۔
گنتی کے چند لوگ اور اتنی ڈھیر ساری فریادیں۔ وہ یوں اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے، جیسے ان کے درمیان کوئی مسیحا آ گیا ہو اور جو ابھی ہاتھ سے اشارا کرے گا اور ایک پل میں زمین پر بکھری لاشیں ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوں گی۔

"میرے خدا......!" اس کی نظریں دور آسمانوں پر بھٹکنے لگیں۔ وہ ان سب کو کیسے حوصلہ دے۔ کہاں سے لائے وہ الفاظ جو زخموں پر مرہم کا کام دیں۔

"بیٹا اچھا ہوا، تم راستہ بدل گئے تھے ورنہ......"

"یہ کون کیا کہہ رہا ہے۔" وہ چونکا اور اس کے سارے احساسات ایک ساتھ بیدار ہو گئے۔
اگلے لمحے وہ ایک ایک چہرا ہاتھوں میں لے کر دیکھ رہا تھا۔

"اماں...... ابا...... بڑے بھیا......!" وہ پاگلوں کی طرح چیخا اور اماں کے خون آلودہ سینے پر پیشانی ٹیک کر رونے لگا۔ اماں اسے اللہ کی اماں میں دے کر خود اس راہ پر چل پڑی تھیں کہ اس کی کوئی پکار، کوئی فریاد انہیں واپسی پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔

"میرے خدا......! کوئی تو مہربان ہاتھ ہو جو مجھے اس درد کے صحرا سے کھینچ لے۔
کوئی مہربان کاندھا جس پر سر رکھوں تو درد کی شدت سے پھٹتا دل ٹھہر جائے۔
کوئی تو آئے......
کوئی تو آئے......"

اس کے آنسو صدا دینے لگے اور اسی وقت ایک ہاتھ اس کے کندھے پر آ ٹھہرا۔

"خضر بابو......! بس کریں۔" پھر وہ گھٹنے زمین پر ٹیکتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی۔ اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"تم ابھی گئیں نہیں۔"

"میں اب نہیں جاؤں گی۔"

"کیا......؟" اس کے منہ سے چیخ نما آواز نکلی اور پوجا اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو پڑی۔

"مجھے اپنے ساتھ لے چلو خضر بابو، میں یہاں نہیں رہ سکوں گی۔ ان درندوں کے درمیان جو آزادی کا خواب دیکھنے والوں کے خون سے ہولی کھیلتے ہیں۔"

"پوجا تم......!" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ بول پڑی۔

"تم اگر نہیں لے کر جاؤ گے تو میں یہیں بیٹھے بیٹھے جان دے دوں گی لیکن واپس نہیں جاؤں گی۔"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔" وہ پھر جھنجلایا اور چیخا۔

"تم کچھ بھی کہو لیکن میں ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی جس میں ہر پل یہ احساس کچوکتا رہے کہ میں ایک خون کا دریا عبور کر کے یہاں تک آئی ہوں۔ اس کے برعکس اس خون کے دریا میں بہہ جانے میں میری شانتی ہے۔ تم جاؤ خضر بابو، میں یہیں بیٹھ رہوں گی زندگی کی آخری سانس تک۔"

وہ اماں کے بے جان چہرے کی طرف یوں دیکھنے لگا، جیسے پوچھ رہا ہو کیا کروں۔ کچھ دیر بعد جب اس کی طرف پلٹا تو بہت خاموشی سے اس کا آنچل سر پر اوڑھا کر اس کے چہرے کے آگے تک کھینچ لیا۔

"کسی کے بھی پوچھنے پر اپنے آپ کو میری بیوی ظاہر کرنا۔"

ہر قسم کے جذبات سے عاری لہجہ تھا وہ اسی پر مطمئن ہو گئی۔
وہ فاصلے جنہیں سمیٹنا اس کے خیال میں ناممکنات میں سے تھا۔ وہ یوں سمٹ کر اسے بیچ راہ میں کھڑا کر گئے تھے جہاں وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ فاصلے سمٹ جانے پر خوش ہو یا انہیں سمیٹ دینے والی ہستیوں کا ماتم کرے۔

○○○

عرفان کچھ دیر کھڑا حق نواز کی طرف تاسف سے دیکھتا رہا۔ اسے اماں پر ترس بھی آ رہا تھا جو بظاہر تو دل پر پتھر رکھے کھڑی تھیں۔ لیکن ان کے ہر انداز سے بے چینی جھلک رہی تھی۔

"اماں......! تم فکر مت کرو، ہم اس کے ساتھ کچھ برا نہیں کریں گے۔"

عرفان نے اماں کے کندھے تھام کر کہا تو ان کی آنکھیں بے اختیار چھلک پڑیں۔

"برائی تو یہ خود اپنے ساتھ کر رہا ہے۔" اماں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"ہاں......! لیکن اب یہ ٹھیک ہو جائے گا۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔ "ہم اسے یہیں رکھ کر بھی اس کا علاج کر سکتے ہیں۔ لیکن تم ماں ہو ناں تم سے اس کا رونا گڑگڑانا برداشت نہیں ہو گا۔ اس لئے ہم اسے دلی کے گھر رکھیں گے۔ اس کا اکیلا گھر ہے۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہو گی۔" پھر وہ کافی دیر تک اماں کو تسلیاں دیتا رہا۔

"کب تک ٹھیک ہو جائے گا......؟" اماں بڑی آس سے پوچھنے لگیں۔

"زیادہ دن نہیں لگیں گے، بس تم دعا کرتی رہنا۔"

"بیٹا......! میں تو ہر دم دعا کرتی ہوں۔"

''ایک کام اور بھی کرو۔'' عرفان نے مسکراتے ہوئے کہا تو اماں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''اس کی شادی کی تیاری کر رکھو۔''

''کیا......؟''

''ہاں اماں......! یہ ٹھیک ہو جائے تو فوراً اس کی شادی کر دینا۔ سر پر ذمہ داری پڑے گی تو اسے نبھانے کے چکر میں آئندہ بری صحبت میں نہیں جائے گا۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم......! لیکن بیٹا کون اسے لڑکی دے گا کیونکہ سب ہی جانتے ہیں کہ یہ۔'' اماں خاموش ہو کر حق نواز کی طرف دیکھنے لگیں جو چارپائی پر اوندھا لیٹا تھا۔

''لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ آج کل ہندوستان سے بہت قافلے آ رہے ہیں۔ جن میں بہت سی بے سہارا لڑکیاں ہیں۔ نواز ٹھیک ہو جائے تو پھر کیمپ جا کر کسی لڑکی کے لئے بات کر لینا۔ تمہارے بیٹے کا گھر بھی بس جائے گا اور کسی بے سہارا کا بھی بھلا ہو جائے گا۔''

عرفان کا پرخلوص مشورہ اماں کو بہت پسند آیا۔ اور وہ پل میں یوں نظر آنے لگیں جیسے ان کا بس چلے تو وہ ابھی جا کر کسی لڑکی کو لے آئیں اور جھٹ پٹ اس کا نواز کے ساتھ نکاح پڑھوا دیں۔

''تو پھر میں اسے لے جاؤں......؟'' عرفان اجازت طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں ہاں......! لے جاؤ......'' اماں نے بخوشی اجازت دے دی تو وہ حق نواز کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اس کی دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اٹھایا اور سہارا دے کر چلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اماں دروازے تک اس کے پیچھے پیچھے چلی تھیں، پھر وہ تو وہیں رک گئیں۔ لیکن ان کی دعائیں حق نواز کے ساتھ ساتھ چلتی رہی تھیں۔

اللہ میاں جب آزمائش میں ڈالتا ہے تو بندے کو اسے برداشت کرنے اور اس سے نکلنے کی طاقت بھی دیتا ہے۔ وہ کبھی انسان کی قوت برداشت سے زیادہ اسے نہیں آزماتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی میں قوت برداشت کم ہوتی ہے اور کسی میں زیادہ اور پھر شاید آزمائش کے لئے بھی اللہ میاں نے شروع ہی سے کچھ لوگوں کو مخصوص کر رکھا ہے، اور ان ہی مخصوص لوگوں میں اماں بھی شامل تھیں۔ جن کی روح پر ازل ہی سے کاتب تقدیر نے آزمائشیں رقم کر دی تھیں۔ وہ اگر اپنی زندگی پر نظر ڈالتیں تو بس گنتی کے چند سال ہی ایسے ملتے جن میں وہ قدرے پرسکون رہی تھیں۔ اور وہ سال حق نواز کی ابا کی ہمراہی میں کٹے تھے۔ اس سے پہلے اور بعد میں وہ ہمیشہ حالات کی چکی میں پستی رہی تھیں۔ لیکن کمال یہ تھا کہ امید کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔

اب جو عرفان حق نواز کو لے گیا تو ان کی امیدیں ایک بار پھر روشن ہو گئیں۔ وہ حق نواز کے لئے دُعا گو تو تھیں ہی اس کے علاوہ جو خواب انہیں عرفان دکھا گیا تھا۔ وہ بھی خاصا خوش کن تھا۔ یعنی حق نواز کی شادی۔

ہر ماں کی طرح انہیں بھی بیٹے کی شادی کا ارمان تھا۔ جو کل تو پورا ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن آج جب امیدیں روشن ہوئیں تو ہر طرف سے جیسے شہنائیوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

دو دن انہوں نے بڑی مشکل سے گزارے اور تیسرے دن جب عرفان انہیں حق نواز کی خیریت سے آگاہ کرنے آیا تو وہ اس کے سر ہو گئیں۔

''مجھے مہاجر کیمپ لے چلو۔''

''ابھی سے......'' وہ حیران ہوا۔ ''نواز کو ٹھیک تو ہونے دیں۔''

''وہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ یقین سے بولیں۔ ''میرا دل کہتا ہے، وہ اب جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تمہاری دُعائیں ساتھ رہیں اماں، تو ایسا ہی ہوگا۔''

''تو پھر مجھے لے چلو۔'' انہوں نے اصرار کیا اور پھر یہ اصرار اتنا بڑھا کہ عرفان کو ان کی بات ماننی پڑی۔ جہاں اس نے چلنے کی حامی بھری وہ جھٹ برقعہ اوڑھ کر تیار ہو گئیں، عرفان ان کی جلد بازی اور پھرتی پر حیران ہوا۔ اور یوں انہیں دیکھ رہا تھا جیسے ان میں اچانک کوئی نئی روح سما گئی ہو۔

کیمپ میں اماں کسی بے سہارا لڑکی کی تلاش میں گئی تھیں۔ لیکن پہلے ہی مرحلے پر وہ ایک نوجوان کو دیکھ کر رک گئیں، جو اپنی آزاد سرزمین پر قدم رکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

وہ...... خضر حیات تھا جو روتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کتنی آرزو تھی اماں اور ابا کو ان آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی۔ اماں کے ہونٹوں پر ہر دم پاکستان بننے کی دعائیں مچلتی تھیں، اور ابا ''بن کے رہے گا پاکستان'' کے نعرے لگایا کرتے۔ ان کی آواز ہمیشہ اُونچی ہوا کرتی تھی۔ جبھی تو سب حیات محمد کے قافلے کی راہ دیکھ رہے تھے۔

''بیٹا......! آزادی کے لئے قربانیاں تو دینی ہی پڑتی ہیں۔ اور پھر تمہاری قربانی رائیگاں نہیں گئی۔'' کسی مہربان نے بڑھ کر سینے سے لگا لیا۔ وہ اسے نہیں جانتا تھا۔ لیکن اس مٹی کے ناتے اپنائیت کا احساس اس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ اور وہ بہت حد تک سنبھل گیا۔

اماں کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں شاید ان کے تصور میں اپنا حق نواز تھا۔ اگر جو وہ بری صحبت کا شکار نہ ہوتا تو ایسا ہی جوان نکلتا۔ ان کی مامتا اسے بھی اپنی آغوش میں لینے کو مچلنے لگی۔ بے اختیار اس کی طرف بڑھیں اور اس کا بازو تھام لیا۔

''بیٹا......! یہاں سب تمہارے اپنے ہیں۔'' اس کے لہجے میں شفقت تھی۔ خضر ان کی طرف دیکھے گیا۔

''کہاں جاؤ گے......؟'' وہ پوچھنے لگیں۔

''کچھ پتا نہیں قسمت کہاں لے جاتی ہے۔'' وہ کہنے لگا۔

''کوئی رشتہ دار......''

''نہیں کوئی نہیں ہے......''

''میرے ساتھ چلو...... میرا گھر ہے، جب تک دل چاہے رہنا۔'' انہوں نے خلوص سے پیشکش کی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''اکیلے ہو......؟'' اماں نے پوچھا تو اسے پوجا کا خیال آیا جو اس کے پیچھے چپ چاپ کھڑی تھی۔

''نہیں یہ میرے ساتھ ہے۔'' اس نے پوجا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ کھڑا کر لیا۔

''تمہاری بیوی ہے......؟'' وہ پوچھنے لگیں۔

''نہیں...... ابھی شادی نہیں ہوئی۔'' اس نے سچ بولا۔

''اچھا اچھا......!'' اماں نے سر ہلایا جیسے ساری بات ان کی سمجھ میں آ گئی ہو، پھر کہنے لگیں۔

''میرے ساتھ چلو...... جب تک کوئی ٹھکانا نہیں ہو جاتا میرے گھر رہنا۔''

''آپ کو تکلیف ہوگی۔''

''ارے تکلیف کیسی بیٹا......! بچوں کے آنے سے تو گھر میں رونق ہو جاتی ہے۔ اور پھر آج کل میرا نواز بھی گھر پر نہیں ہے، تم آ جاؤ گے تو میرا اکیلا پن دور ہو جائے گا۔'' اس کے ساتھ ہی انہوں نے پوجا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

''جوان لڑکی کو لے کر کہاں مارے مارے پھرو گے آؤ میرے ساتھ۔''

وہ پوجا کو لیے آگے بڑھ گئیں۔ اور وہ کسی معمول کی طرح ان کے پیچھے چل پڑا۔

''اماں وہ لڑکی......'' عرفان نے انہیں یاد دلانا چاہا کہ وہ کس مقصد سے یہاں آئی تھیں۔

''کون سی لڑکی......؟''

''نواز کے لئے......''

''ہاں ہاں......! وہ بھی آ کر دیکھ لوں گی، ابھی تو گھر چلو۔ بچے اتنی دور سے آئے ہیں۔ تھک بھی گئے ہوں گے۔'' وہ یوں بولیں جیسے سچ مچ ان کے اپنے بچے کہیں دور سے آئے ہوں۔

عرفان نے حیرت سے انہیں دیکھا اور پھر قدم روک کر خضر کے ساتھ ہو لیا۔

''اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔''

اماں نے گھر میں داخل ہوتے ہی کہا تو وہ دونوں چھوٹے آنگن میں کھڑے نظروں کا زاویہ بدل بدل کر گھر کا جائزہ لینے لگے۔

گھر خواہ کیسا بھی تھا، فی الحال رہنے کو ٹھکانا مل گیا تھا۔ ان کے لئے یہی بہت تھا۔

''تم دونوں منہ ہاتھ دھو لو بیٹا'' اماں انہیں چپ چاپ کھڑے دیکھ کر کہنے لگیں۔

''نہانا چاہو تو نہا لو، تھکن اتر جائے گی۔''

''پہلے آپ نہا لیں۔'' وہ کہتی ہوئی اماں کے پاس جا بیٹھی۔ اماں رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ وہ ان کے نہ نہ کرنے کے باوجود ہاتھ بٹانے لگی۔

پھر جب کھانا وغیرہ کھا کر فراغت سے بیٹھے تو مسافتوں کی تھکن غالب آ گئی۔ گرمیوں کے دن تھے۔

خضر نے آنگن میں سونے کی خواہش کا اظہار کیا، تو اماں پوجا کو لے کر اندر چلی گئیں۔

آسمان پر جھلملاتے ستاروں کے قافلے اترے چلے آ رہے تھے۔ ابتدائی تاریخوں کا چاند بہت جلد اپنا سفر تمام کر گیا تھا۔ اسی لئے اب ستاروں ہی کی حکمرانی تھی۔ وہ سیدھا لیٹا جھلملاتے ستاروں سے ان ہستیوں کا پتا پوچھنے لگا جو بیچ راہ میں اچانک اس سے بچھڑ گئی تھیں۔

''اماں......! ابا......! بڑے بھیا!'' وہ بے آواز صدائیں دینے لگا، اور یونہی پکارتے پکارتے نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اور......

سونا تو وہ بھی چاہتی تھی لیکن نیند مہربان ہو کے نہیں دے رہی تھی۔ اجنبی دیس، اجنبی ماحول کی اجنبی فضائیں اور اجنبی لوگ۔ وہ خوفزدہ نہیں تھی، لیکن کیونکہ ابھی اپنائیت کا احساس نہیں جاگا تھا۔ اس لئے کچھ بھی اپنا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہیں اس نے خضر کے ساتھ آ کر غلطی تو نہیں کی لیکن اب یہ سب سوچنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ کیونکہ سب کشتیاں تو جل ہی چکی تھیں۔

وہ مسلسل کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تھی۔ بدن دکھنے لگا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، ساتھ والی چارپائی پر اماں بے خبر سو رہی تھیں اور گہری خاموشی میں باہر سے خضر کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز اندر تک آ رہی تھی۔ اچانک اسے ڈر لگنے لگا تو اس نے اٹھ کر اماں کا کندھا ہلا ڈالا۔

''کیا ہوا......؟'' اماں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ ان کی گود میں سر رکھ کر رو پڑی۔

"ارے ارے......!" اماں ایک دم پریشان ہوگئیں۔

"تم رونے کیوں لگیں بیٹا......؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یونہی روتی رہی۔ شاید دل کا بوجھ ناقابل برداشت ہوگیا تھا۔ جسے وہ آنکھوں کی راہ ہلکا کر رہی تھی۔ کافی دیر بعد جب اس کی سسکیاں دم توڑ گئیں اور آنکھوں نے مزید برسنے سے انکار کردیا تب وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"مجھے ماتا جی یاد آرہی ہیں۔" اس نے اپنے رونے کا عذر تراشا اور اماں اس کے منہ سے ماتا جی کا لفظ سن کر چونک گئیں۔

"کون ہو تم......؟"

"پوجا......!"

"کیا خضر تمہیں زبردستی اپنے ساتھ لایا ہے......؟" اماں کو شبہ ہونے لگا۔

"نہیں......میں اپنی مرضی سے آئی ہوں۔"

پھر اس نے انہیں ساری بات بتادی۔ اماں خاموشی سے اس کی رام کہانی سنتی رہیں۔ جب وہ خاموش ہوئی تو کہنے لگیں۔

"اب تم سو جاؤ۔ میں صبح تم سے بات کروں گی۔"

"کوئی تبصرہ نہیں، کوئی ملامت نہیں۔" وہ حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے جب آہی گئی ہو تو یہی تمہاری زمین اور یہی تمہارا گھر ہے۔"

اماں نے تسلی دی اور پھر اسے اپنے ساتھ ہی لٹالیا۔ ان کے پرشفقت سینے میں منہ چھپایا تو جہاں اجنبیت کی دیواریں گریں، وہاں نیند بھی مہربان ہوگئی۔

گو کہ رات وہ بہت دیر سے سوئی تھی، اس کے باوجود صبح بہت جلدی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اماں کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ وہ کچھ دیر تک بالکل خالی الذہن سی لیٹی رہی، پھر اٹھ کر کمرے کے دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ اماں برآمدے میں جاء نماز پر بیٹھی۔ نماز کے بعد تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ انہیں اس کی موجودگی کا احساس ہوا تو بلا کر اپنے پاس بٹھالیا۔ وہ بہت خاموشی سے ان کی حرکت کرتی انگلیوں اور ایک کے بعد ایک گرتے دانوں کو دیکھنے لگی۔ پھر تسبیح رکھ کر انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ پھیلا دیے، تو اس کی نظریں ان کے چہرے پر بھٹکنے لگیں۔ ہلتے ہونٹوں سے الفاظ موتیوں کی صورت نکل رہے تھے۔

"میرا اللہ تو کل کائنات کا مالک ہے، جسے چاہتا ہے اپنے راستے کی آگاہیاں عطا کرتا ہے، ہم سب تیرے گناہ گار بندے ہیں، تو اپنی رحمتوں سے ہمارے گناہوں کو بخش دے، کہ تو بخشنے والا

مہربان ہے۔"

انہوں نے منہ پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اس کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں جھکالیں۔

"جاؤ......منہ ہاتھ دھولو۔"

انہوں نے اٹھ کر جاء نماز لپیٹی، پھر اس کے کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"تمہارے کپڑے بہت میلے ہو رہے ہیں۔ کیا خضر کے بیگ میں تمہارے کپڑے نہیں ہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا، میں دیکھتی ہوں۔" وہ اندر چلی گئیں۔ اور اپنا اچھے دنوں کا ایک سوٹ نکال کر لے آئیں۔

"لو......نہا کر اسے پہن لو۔"

اس نے چپ چاپ ان کے ہاتھ سے کپڑے لے لیے اور اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلی گئی۔ جس وقت وہ نہا کر نکلی تو خضر اٹھ چکا تھا اور اماں اس کے پاس بیٹھی جانے کیا بات کر رہی تھی، کہ اسے دیکھ کر خاموش ہوگئیں، اماں کے خاموش ہونے پر خضر نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا، اور پھر جیسے نظریں ہٹانا بھول گیا۔ اس کا بھیگا بھیگا سراپا تپتے وجود پر جیسے پھوار برسانے لگا۔ اب نہ مٹنے والے فاصلوں کا احساس نہیں تھا۔ اس لئے وہ ذرا سا مسکرا دیا۔ پھر اماں کا خیال کر کے سیدھا ہو بیٹھا۔

"یہیں آجاؤ بیٹا......!" اماں نے اسے شش و پنج میں دیکھ کر بلایا۔ تو وہ قدرے جھجکتی ہوئی ان کے پاس آبیٹھی۔

"ہم ابھی تمہارے بارے میں ہی بات کر رہے تھے۔"

اماں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔

"اب جبکہ تم اپنا...... گھربار اور دیس چھوڑ آئی ہو، تو ظاہر ہے ہم تمہیں بے یار و مددگار تو نہیں چھوڑیں گے۔ خضر تم سے شادی کا خواہش مند ہے اور میرا خیال ہے تم بھی اس کی خاطر یہاں تک آئی ہو تو کیا اس کی خاطر تم اپنا دھرم۔"

اماں خاموش ہوگئیں اور وہ فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکی۔

"کوئی زبردستی نہیں ہے بیٹا......! کیونکہ ہمارے مذہب میں زبردستی جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر تم خوشی سے قبول کرو تو۔"

"پوجا......! تم اچھی طرح سوچ لو۔" وہ کہنے لگا۔ اور سوچتے ہوئے یہ خیال بھی دل میں مت لانا کہ اگر تم نے اپنا دھرم نہ چھوڑا تو ہم تمہیں بے آسرا چھوڑ دیں گے۔"

"مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے خضر بابو۔ کیونکہ میں اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ آئی ہوں۔ گھر اور دیس کے ساتھ دھرم بھی۔"

خضر اور اس کے ساتھ اماں بھی کتنی دیر تک چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ جو اپنی بات کہہ کر بڑے اطمینان سے بیٹھی تھی۔

"تو کیا تم بخوشی......" وہ یقین چاہتا تھا۔

"ہاں......!"

"ہاں......!"

"ہاں......!" وہ یقین دلاتی گئی۔

اماں نے اسی وقت عرفان کو بلایا۔ پھر اس کے ہاتھ مولوی صاحب کو بلا بھیجا۔ جن کے سامنے اس نے خضر کے یقین پر مہر ثبت کر دی۔ اور شام میں چند لوگوں کی موجودگی میں اس نے ایک بار پھر اک ذرا سی ہاں کو تین بار دوہرا کر اپنے تمام جملہ حقوق خضر کو سونپتے ہوئے درمیانی فاصلے سمیٹ لیے۔

پھر اپنی سرزمین پر نئی زندگی کی ابتدا یوں ہوئی کہ جسے دیکھ کر ایمان ڈولنے لگتا تھا۔ جب اس پر ایمان لائی تو زندگی کچھ سہل ہو گئی۔ ورنہ وہ اکیلا کبھی بھی اتنی جلدی زندگی کی طرف نہیں لوٹ سکتا تھا۔

اور......وہ شاید آئی ہی اس لئے تھی کہ اس کے لوگوں نے جو زخم اس کی ذات پر لگائے تھے وہ ان کی تلافی کرنا چاہتی تھی۔ گو کہ وہ اکیلا زخم خوردہ نہیں تھا پھر بھی وہ تنہا لڑکی اس حد تک ہی کر سکتی تھی۔ ہر مقام پر اس کے زخموں پر اپنی محبتوں کے نرم نرم پھاہے رکھ کر اسے یہ احساس دلاتی کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔

وہ دونوں زیادہ دن اماں پر بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے۔ اس لئے خضر نے فوری طور پر جاب کی تلاش شروع کر دی۔ قسمت مہربان تھی بہت جلد اسے معمولی سہی لیکن نوکری مل گئی اور پہلی تنخواہ پر ہی اس نے الگ گھر کا انتظام کر لیا۔ اماں روکتی رہ گئیں۔ بے شک ان کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ مزید ان پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ ویسے بھی نواز کافی حد تک بہتر ہو گیا تھا اور اب اماں کو اس کا گھر بھی بسانا تھا۔ ایسی صورت میں اس چھوٹے سے گھر میں ان کے لئے ویسے بھی گنجائش نہ رہتی۔

"بیٹا......! آتے جاتے رہو گے ناں۔" اماں واقعی ان کے جانے سے بہت آزردہ تھیں۔

"ہاں......اماں......! کوئی بہت دور تو نہیں جا رہے ہم، اسی شہر میں ہیں اور پھر آپ کے سوا ہمارا ہے ہی کون۔"

خضر نے کہا پھر دُعائیں لینے کی خاطر ان کے آگے جھک گیا۔ اماں نے سر پر ہاتھ پھیر کر ڈھیروں دعائیں دیں پھر پوجا کو جواب صالحہ بیگم تھی...... سینے سے لگا لیا۔

"خدا تم دونوں کو اپنی امان میں رکھے۔"

ان کے جانے کے بعد بھی دیر تک اماں انہیں دُعائیں دیتی رہی تھیں۔

○ ○ ○

اب اماں کو حق نواز کی فکر تھی......اور جس روز عرفان نے آ کر بتایا کہ اب بس دو ایک دن میں وہ اسے یہاں لے آئے گا۔ اسی روز اماں ایک بار پھر مہاجر کیمپ جانے کو تیار ہو گئیں۔

"اماں......! میں تو کہتا ہوں پہلے یہیں محلے میں کہیں بات کر دیکھو" عرفان نے مشورہ دیا تو وہ کہنے لگیں۔

"بیٹا......! میں تمہارے کہنے سے پہلے ہی کوشش کر چکی ہوں۔"

"پھر......؟"

"کوئی بھی تیار نہیں۔ سب کہتے ہیں۔ ہم نے اپنی لڑکی کے نصیب نہیں پھوڑنے۔"

"تم نے بتایا نہیں کہ نواز اب ٹھیک ہو گیا ہے۔"

"بتایا ہے لیکن لوگ کہتے ہیں، کتنے دن ٹھیک رہے گا۔ پھر اسی راستے پر چلنے لگے گا۔" پھر اندیشوں میں گھر کر پوچھنے لگیں۔ "کیا لوگ ٹھیک کہتے ہیں؟"

"نہیں اماں......! تم کسی کی باتوں پر یقین مت کرو۔ اللہ چاہے گا۔ وہ اب اچھا ہی رہے گا۔" عرفان نے تسلی دی۔

"تم ہی کہیں بات کر دیکھو۔" اماں اس سے کہنے لگیں۔

"جب تمہاری بات لوگوں نے نہیں مانی تو میری کیا مانیں گے خیر چھوڑو لڑکیاں بہت مل جائیں گی۔ چلو چلتے ہیں۔" اس نے کہا تو اماں جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔

پھر جب اماں ایک بے سہارا لڑکی کو گھر لائیں تو سب ہی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے تھے۔ ایسی لڑکی تو اس پورے محلے میں کہیں نہ تھی۔ سفید رنگت جو یقیناً کبھی گلابی بھی رہی ہو گی۔ اور جو

حالات نے اس سے چھین لی۔ سیاہ پلکوں کے حصار میں بڑی بڑی آنکھیں، شنگرفی ہونٹ اور ہونٹوں کے کنارے سیاہ تل جس نے اس کے چہرے کو انوکھا حسن بخش دیا تھا۔

"یہ مہر النساء ہے۔" اماں ہر آنے والی خاتون سے اس کا تعارف کراتیں۔

"ماشاءاللہ......" دیکھنے والوں کے منہ سے بے ساختہ ہی نکلتا۔

اور مہر النساء......!

حالات کی ستائی ہوئی مظلوم لڑکی۔

پتا نہیں شروع ہی سے ایسی کم گو تھی یا حالات نے اس کے ہونٹوں پر قفل ڈال دیے تھے۔ خاموش چپ چاپ سب کو تکا کرتی۔ اس نے اپنے حالات نہیں بتائے تھے اور نہ ہی اماں نے اسے کریدنے کی کوشش کی تھی۔ شروع کے ایک دو دن وہ خاصی خوفزدہ اور سہمی سہمی سی رہی۔ شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسے ایک سائبان میسر آ گیا ہے۔ لیکن اماں کی محبتوں اور شفقتوں نے بہت جلد اس کے دل سے ہر قسم کا خوف دور کر دیا۔ وہ مطمئن نظر آنے لگی۔ اور اسی گھر کو مقدر جان کر شاکر بھی ہو گئی۔

صبح ناشتے کے بعد جب اماں مشین لے کر بیٹھیں تو وہ ان کے پاس آ کر کہنے لگی۔

"آپ ہٹ جائیں اماں! میں سی دیتی ہوں۔"

"تم۔" اماں سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"مجھے سینا آتا ہے۔" وہ فوراً بولی۔

"یہ تو اچھی بات ہے، لیکن یہ کپڑے تمہارے سینے کے لئے نہیں ہیں۔"

"کیوں......؟"

"یہ میں اجرت پر سی رہی ہوں۔"

"تو کیا ہوا...... میں بھی آپ کا ہاتھ بٹا دوں گی۔"

"نہیں بیٹا......! تمہیں میں بہو بنانے کو لائی ہوں، اور میری تو کیا حق نواز کی غیرت بھی گوارا نہیں کرے گی کہ تم یہ کام کرو۔"

"یہ کوئی برا کام تو نہیں ہے۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"محنت کا کوئی کام بھی برا نہیں ہوتا بیٹی......! لیکن میرے ہوتے ہوئے تم کرو۔ یہ اچھا نہیں لگتا...... اور پھر اللہ رکھے میرے حق نواز کو، وہ کمائے گا۔"

وہ سر جھکائے دوپٹے کا کونا انگلی پر لپیٹنے لگی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور عرفان نے وہیں سے آواز دی۔

"اماں......!"

وہ اب پہلے کی طرح آواز دینے کے ساتھ فوراً اندر نہیں آتا تھا۔ گو کہ اماں نے اسے منع نہیں کیا تھا، پھر بھی وہ خود ہی مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

"تم اندر جاؤ بیٹی......!" اماں نے کہا تو وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اور اس کے جاتے ہی اماں نے عرفان کو بلا لیا۔

"کیسے آئے بیٹا......؟" اماں پوچھنے لگیں۔

"نواز کے کوئی ڈھلے ہوئے کپڑے ہوں تو دے دو۔"

"بیٹھو...... میں لے کر آتی ہوں۔" اماں اٹھ کر اندر چلی گئیں، پھر کچھ دیر بعد ہی کپڑے لے کر آ گئیں۔

"بیٹا......! بہت دن ہو گئے ہیں نواز کو دیکھے ہوئے۔"

"بس ابھی لا رہا ہوں اسے۔"

"اچھا......!" اماں ایک دم خوش ہو گئیں۔ "ٹھیک تو ہے میرا بچہ......"

"ابھی آئے گا تو خود ہی دیکھ لینا۔" وہ اماں کے ہاتھوں سے کپڑے لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلتا ہوں۔"

"اچھا......!" اماں نے ہمیشہ کی طرح اسے رکنے کے لئے نہیں کہا۔ وہ چلا گیا تو اماں جلدی جلدی تخت پوش پر پھیلے کپڑے سمیٹنے لگیں۔ ساتھ ہی اسے بھی آواز دے ڈالی۔

"مہر النساء بیٹی......! بکس سے صاف چادر نکال کر بچھا دو۔ ابھی میرا حق نواز آنے والا ہے۔"

"حق نواز......!" کانوں نے سنا ہونٹوں نے دہرایا۔ اور دھڑکنوں نے شور مچا دیا۔ وہ اٹھی اور بکس سے چادر نکال کر بچھانے لگی۔ اس دوران اماں اندر آئیں۔ پھر فوراً ہی پلٹ بھی گئیں۔

بوکھلاہٹ میں انہیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک پیر اندر ایک پیر باہر۔ کوئی چوتھی بار وہ اندر آئیں تو دروازے پر دستک ہونے لگی۔ "آ گیا" کہتی ہوئی وہ باہر کی طرف لپکیں جبکہ وہ وہیں کھڑی انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

کچھ دیر بعد اس کے کانوں نے کسی کے رونے کی آواز سنی تو وہ بڑھ کر کمرے کے دروازے تک آ گئی۔ شاید وہی حق نواز تھا جو اماں کے کندھے سے لگا رو رہا تھا اور اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگ رہا تھا۔ اور اماں کے ناتواں بازوؤں میں جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ اس کے

پورے وجود کو سہارا دیے کھڑی تھیں۔ پھر جیسے ہی وہ اسے لیے ہوئے پلٹیں۔ وہ چپ چاپ دروازے سے ہٹ کر اندر آ گئی۔

اماں، نواز اور عرفان کو لے کر برآمدے میں تخت پوش پر ہی بیٹھ گئی تھیں۔ وہ عرفان کی بہت مشکور تھیں، اور مسلسل اسے دعاؤں سے نواز رہی تھیں۔

"بس کرو اماں......! میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔" اماں کی دعاؤں کے ساتھ تعریفوں سے وہ شرمندہ ہونے لگا۔ تو موضوع بدلتے ہوئے کہنے لگا۔

"اب تو نواز کی شادی کی بات کرو اور میں تو کہتا ہوں اسی جمعہ کو۔"

"کیا کہا......؟" نواز فوراً بول پڑا۔ "کیسی بات کرتے ہو عرفان بھائی!"

"عرفان ٹھیک کہہ رہا ہے میرا بھی یہی خیال ہے۔"

اماں نے کہا تو وہ حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"اماں پہلے مجھے اپنے پیروں پر تو کھڑا ہونے دیں، پھر شادی کی بات کیجیے گا۔ ورنہ میں کہاں سے کھلاؤں گا اسے۔"

"کھلانے والا اللہ ہے۔ تم کیوں فکر کرتے ہو۔ ہاں کوشش کرو۔ جلد کہیں کام مل جائے لیکن تمہارے کام ملنے تک میں اسے یونہی نہیں بٹھائے رکھ سکتی۔"

"کسے......؟"

"مہر النساء کو......"

"مہر النساء......!" اماں کی پہیلیاں اس کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ وہ الجھ کر پوچھنے لگا۔

"یہ مہر النساء کہاں سے آ گئی......؟"

پھر اماں نے اسے مہر النساء کے بارے میں بتایا اور خضر اور پوجا کا ذکر بھی کیا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس دوران اس کی نظریں بار بار اس دروازے کی طرف اٹھ جاتیں، جس کے دوسری طرف مہر النساء تھی۔

"پھر بھی اماں......!" وہ پوری بات سننے کے بعد کہنے لگا۔ "پہلے مجھے کام پر لگنے دیں۔"

"کام بھی لگ جائے گا۔ آخر خضر نے بھی تو کام لگنے سے پہلے شادی کی، اور پھر شادی ہو جائے گی تو مہرو بھی گھر میں آزادی سے رہے گی۔"

اماں کی یہ بات مناسب تھی، عرفان نے بھی تائید کی، اور ان دونوں کے آگے اسے خاموش ہونا پڑا۔

پھر جمعہ کی شام بہت سادگی سے چند لوگوں کی موجودگی میں حق نواز اور مہر النساء کا نکاح ہوا،

چند لوگ جنہوں نے شرکت کی ان میں خضر اور صالحہ بھی شامل تھے۔ اماں نے خاص طور سے عرفان کو بھیجا تھا بلوانے کو۔

○○○

وہی صبحیں تھیں اور وہی شامیں، لیکن موسم بدلنے سے ان کے انداز اور مزاج بدل گئے تھے۔ صبحیں کہر میں ڈوبی ہوئی اور شامیں ڈھیر ساری خنکی لیے آتیں۔ اسی بدلتے موسم نے وقت گزرنے کا احساس بھی دلایا۔ اوائل فروری کی خنک سی شام کو باورچی خانے میں لکڑیوں سے آگ جلاتے ہوئے صالحہ نے خضر سے کہا۔

"ہماری شادی کو چھ ماہ ہو گئے ہیں۔"

"اچھا......!" وہ چونکا پھر کہنے لگا۔ "اتنی جلدی چھ مہینے گزر گئے۔ مجھے تو ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے۔"

"ارے......!" وہ خوامخواہ ہنس پڑی۔ "تم اسے جلدی کہتے ہو۔ جبکہ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ اپنے لوگوں کے درمیان سے آئے ہوئے، انہیں دیکھے ہوئے۔"

"صالحہ......! کیا تمہیں اپنے لوگ بہت یاد آتے ہیں؟"

وہ بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا تو وہ جواب دینے کے بجائے جھک کر لکڑیوں کے درمیان پھونکیں مارنے لگی۔ جو تھوڑی بہت آگ جل رہی تھی۔ وہ بھی بجھ گئی اور ایک دم بہت سارا دھواں اٹھنے لگا جس سے اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ وہ پھر بھی باز نہیں آئی۔ آگ جلا کر ہی دم لیا۔ اور جب سیدھی ہوئی تو آنکھوں سے بے تحاشا پانی بہہ رہا تھا۔ وہ کتنی دیر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے بہتے پانی کا سبب سوچتا رہا۔

"کیا دیکھ رہے ہو......؟" اس کے پوچھنے پر اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"کیا تمہیں اپنے لوگ بہت یاد آتے ہیں۔"

"نہیں...... بہت تو یاد نہیں آتے، بس کبھی کبھی خیال آ جاتا ہے۔"

"تمہارا دل چاہتا ہے ان سے ملنے کو۔"

"دل چاہے گا بھی تو کیا کروں گی۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر بات ٹالنے کی کوشش کرنے لگی۔

"سنو......! اگر کبھی تمہارا دل ان سے ملنے کو چاہے اور تم وہاں جانا چاہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔"

''کبھی موقع ملا تو دونوں چلیں گے۔'' اس نے بات ختم کر دی، اور وہ بھی مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

زندگی جب کافی حد تک معمول پر آ گئی تو وہ اپنی ذات سے نکل کر زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی سوچنے لگے۔ ورنہ اب تک تو وہ اپنی ذات تک ہی محدود تھے۔ خضر جو معمولی جاب کر رہا تھا اسے اپنی جائداد کا خیال آیا جو وہ چھوڑ کر آیا تھا۔ اور یہاں اس کی خوش قسمتی تھی کہ کاغذات اسی کے پاس تھے، جن کے ذریعے اس نے کلیم کر دیا۔ اور پھر جس روز صالحہ نے احتشام کو جنم دیا، اسی روز اس کا کلیم منظور ہوا۔ قسمت مہربان ہو تو راہیں خود بخود کھلتی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ بھی یہی ہوا، کسی مقام پر کوئی تردد نہ ہوا، نہ کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر کام خود بخود جیسے آسان ہوتا گیا۔ انہیں پوری جائیداد کے برابر نہ سہی آدھی یا اس سے کچھ کم جو بھی ملا۔ وہ ان کے لئے بہت کافی تھا۔ اس رات وہ دیر تک اپنی آئندہ زندگی کا پلان بناتے رہے۔

''ایسا کرو خضر......! سب سے پہلے اپنا گھر بنانے کی سوچو۔'' وہ کہنے لگی۔

''ہاں......! میرا بھی یہی خیال ہے۔ اپنا گھر بنا لیں، اس کے بعد میں کوئی بزنس کرنے کی سوچوں گا۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔ ''تمہارے ذہن میں اپنے گھر کے لئے کوئی تصور ہو تو کہو۔''

''میں کیا کہوں۔''

''نہیں صالحہ......! ہر لڑکی ایک گھر کا تصور لے کر ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر بڑھتی عمر کے ساتھ وہ اسے اپنی خواہش کے مطابق سجاتی سنوارتی ہے۔ تم اپنی خواہش کو بلا جھجک زبان دے دو۔''

وہ کچھ دیر تک سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی رہی پھر گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکاتے ہی جیسے اس نے خوابوں کے اس جزیرے میں قدم رکھ دیے ہوں۔ جسے اس نے پلکوں پہ سجایا تھا۔ اس وقت جب وہ پوجا تھی۔

جب آہٹیں من آنگن میں ہلچل مچایا کرتیں۔

جب انجانے میں کوئی خشک پتا پیر کے نیچے آ جاتا تو دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا تھا۔

اور......

جب نئی کونپلیں پھوٹتیں تو سپنوں کے رنگ آپ ہی آپ گہرے ہو جاتے تھے۔

قدموں نے خواب جزیروں کو کیا چھوا کہ وہ مکمل طور پر ان کی گرفت میں آ گئی، اور جب بولی تو لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ اور انداز وہی پرانا۔

''خضر بابو......! تم ٹھیک کہتے ہو، سپنے سجانے میں ہم لڑکیاں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ میں

نے بھی سپنے سجائے، اور شاید تم وشواس نہ کرو کہ میرے سپنوں میں تم شروع ہی سے میرے ساتھ رہے۔ اس وقت مجھے اپنے اور تمہارے درمیان نہ مٹنے والا فاصلہ حائل نظر آتا تھا۔ اس لئے پہلے پہل میں اپنے سپنوں سے خوفزدہ ہوئی، پھر کوشش کی کہ تمہیں نہ سوچوں لیکن مجھے کسی بھی طرح اپنی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی، پھر میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو شانت کیا کہ سپنا ہی تو ہے جسے میری ہی آنکھیں دیکھتی ہیں، کوئی اور کہاں جان سکے گا۔''

وہ چپ چاپ اس کی طرف دیکھے گیا، اور وہ اس گھر کا نقشہ کھینچنے لگی۔ جسے وہ تصور میں دیکھتی تھی۔

○ ○ ○

حق نواز اور مہر النساء کی شادی کو بھی ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ نواز اب تک بیکار تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اس نے کام کے لئے کوشش نہیں کی، وہ اپنی سی ہر کوشش کر چکا تھا۔ لیکن کہیں قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اُس طرف قسمت مہربان تھی تو اس طرف نامہربان۔ وہ صبح سے شام تک کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا اور جب شام گئے مایوس لوٹتا تو اس کے حوصلے جواب دے چکے ہوتے۔ ایسے میں اماں اور پھر مہر النساء اسے نئے سرے سے حوصلہ دیتیں۔

جس طرح مہرو اچانک اس کی زندگی میں آئی تھی۔ اسی طرح اچانک اس پر چھا گئی تھی اس کی کم سخنی اور خدمت گزاری سے وہ بہت متاثر تھا۔ اور چاہتا تھا، کہ جس طرح وہ محبت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بے لوث خدمت کرتی ہے۔ اسی طرح وہ بھی اس کے لیے کچھ کرے اور اس کے لیے کچھ کرنے کی لگن ہی میں وہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتا تھا۔ اس کا یہی معمول تھا۔ روزانہ ایک نئی امید لے کر جاتا لیکن اب تو ساری امیدیں دم توڑنے لگی تھیں۔

''مہرو......! میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔'' وہ مایوس ہو گیا تھا۔

''ارے......! ابھی تو زندگی پڑی ہے۔ تم ابھی سے ایسی باتیں کرنے لگے۔'' مہرو نے مسکرا کر حوصلہ دیا۔

''یہی تو دن تھے، جب میں تمہیں بے فکری کی زندگی دیتا۔ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولنے کے دن فکر معاش کی نذر ہوئے جاتے ہیں۔''

''کیسے...... کیسے ٹھیک ہوگا سب......؟''

''مایوسیوں میں مت گھرو نواز......! کسی نہ کسی دن تمہاری کوششیں ضرور بار آور ہوں گی۔''

وہ اس کے چہرے پر چھائے آزردگی کے بادل دیکھ کر خود بھی دکھی ہو رہی تھی۔ پھر بھی اس

کی دلجوئی کرتی رہی۔

کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔اس صبح وہ اٹھا تو مہرو اس وقت تک سو رہی تھی۔اسے حیرت ہوئی کیونکہ وہ تو اس سے بہت پہلے اٹھ جایا کرتی تھی۔

''مہرو......!''اس نے پکارا اور پھر مسلسل پکارنے پر بھی وہ نہیں اٹھی۔تو پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کرنے کی کوشش کی۔لیکن پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہی احساس ہوا کہ اسے بہت تیز بخار ہو رہا ہے، وہ پریشان ہوا، اور فوراً اماں کو بلا لایا۔اماں کیا کر سکتی تھیں بس ٹھنڈے پانی کی پٹیاں ہی اس کے ماتھے پر رکھتی رہیں۔اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ بخار کی شدت میں کچھ کمی ہوئی اور وہ آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی تھی۔

''تم اس کے پاس بیٹھو...... میں چائے بنا لاتی ہوں۔''اماں اٹھ کر چلی گئیں تو وہ اس سے کہنے لگی۔

''تم آج گئے نہیں......؟''

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پھر کیا کروں جا کر۔یونہی خوار ہو کر تو واپس آ جاتا ہوں۔''

''ہو سکتا ہے، آج کوئی بات بن جاتی۔''وہ ہر صبح یہی جملہ بولتی تھی۔اور پھر عرفان بھائی نے بھی تو کہا تھا کہ۔''

''عرفان کے پاس میں کل ہی گیا تھا۔''وہ اس کی بات کاٹ کر کہنے لگا۔

''کہہ رہا تھا۔ابھی جگہ خالی نہیں ہوئی۔''

''اچھا......!''وہ طویل سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

''پہلے میں تمہاری دوا لے آؤں۔''وہ کمرے سے نکل کر اماں کے پاس آ گیا۔

''اماں مہرو کی دوا۔''وہ اتنا کہہ کر ہی خاموش ہو گیا۔

''بیٹا! میرے پاس تو آج پیسے نہیں ہیں۔ہاں ذکیہ کی اماں نے شام کو دینے کو کہا ہے وہ بھی اگر ذکیہ کے ابا کو مل گئے تب۔''

''اچھا......!''وہ کچھ دیر خاموش کھڑا جانے کیا سوچتا رہا۔پھر کہنے لگا۔

''مہرو کو اس وقت دوا کی ضرورت ہے۔میں کوشش کرتا ہوں۔کہیں مزدوری ہی مل جائے تو......''وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر گھر سے نکل گیا۔

شہر میں جہاں جہاں کام ہوتا نظر آیا۔وہ وہیں رکا۔سب سے بات کی اور کہیں بات نہیں بنی۔

دوپہر ڈھلی، پھر شام ہوئی۔لوگ کام بند کر کے گھروں کو جانے لگے، وہ اب کس آس پر رکتا۔قدموں کو واپسی کے لیے مڑا تو مہرو کا خیال آیا۔

اسے دوا کی ضرورت تھی اور وہ اتنا بھی نہیں کر سکتا۔دل بوجھل ہوا اور واپسی کے لئے اٹھتے قدم رک گئے۔

''کیا آج بھی اس کے سامنے اپنی مایوس صورت لے کر جاؤں۔''آزردگی سے سوچتا ہوا وہیں بیٹھ گیا۔اس کی نظریں آتے جاتے لوگوں کے چہروں پر بھٹک رہی تھیں۔

دن بھر کی مشقت کے باوجود ہر چہرے پر ایک اطمینان تھا اور گھر جانے کی جلدی۔وہ حسرت سے دیکھتا رہا۔شام گہری ہوئی اور پھر رات کی سیاہی پھیلنے لگی، وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔حقیقت میں اس میں اٹھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

''لو یار......! مارو دم...... مٹے غم......''

وہ خالی خالی نظروں سے اپنی طرف بڑھے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا۔

''لو ناں......!''اصرار بڑھا اور وہ انکار کی طاقت کھو بیٹھا۔

''میں یونہی بھٹکتا پھر رہا تھا۔''کچھ دیر بعد وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔''مہرو کی دوا نہیں ہے۔اماں کے پاس پیسے نہیں ہیں، اور میں بغیر پیسوں کے دوا کہاں سے لاؤں، جسے ضرورت ہو گی خود ہی آئے گا۔میں کیوں سارے جہاں کا غم بانٹتا پھروں۔''جو جی میں آیا بولتا گیا۔شاید بہت دنوں سے اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا۔اور اب جو بولنے پر آیا تو کسی طرح خاموش ہی نہیں ہوا۔گو کہ سننے والا کوئی نہیں تھا۔اور اسے اس کی پرواہ بھی نہیں تھی۔

اماں اور مہرو نے اس کی راہ دیکھتے دیکھتے پوری رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔وہ دونوں ہی پریشان تھیں۔کہ آخر کہاں چلا گیا ہے۔صبح ہوتے ہیں اماں نے عرفان کو بلا بھیجا اور ابھی اسے اس کی تلاش میں بھیجنا ہی چاہتی تھیں کہ وہ آ گیا۔

''کہاں رہ گئے تھے تم......؟''اماں فوراً اس کی طرف لپکیں۔

''کام کی تلاش میں گیا تھا۔''

''رات میں کون سا کام تلاش کرتے رہے......؟''وہ جواب دینے کے بجائے اندر چلا گیا۔جہاں مہرو اس کی منتظر تھی۔وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا لیٹ ہو گیا۔

''کیا ہوا نواز......؟''وہ پریشانی سے پوچھنے لگی۔

''کچھ نہیں......''اس نے رکھائی سے کہتے ہوئے کروٹ بدل لی۔کچھ دیر بعد اماں اندر آئیں تو وہ سو رہا تھا۔

''پتا نہیں بے چارا کہاں مارا مارا پھرتا رہا ہے۔ جو یوں تھک کر سو گیا ہے؟'' بے چاری مامتا کی ماری اس کے لئے پریشان ہو گئیں۔

پھر یہ حالات ہی تھے جنہوں نے اسے دوبارہ پرانے راستے پر چلنے پر مجبور کیا۔ اتنے ڈھیر سارے مسائل، پریشانیاں، دکھ، وہ کس کس کا سامنا کرتا۔

اماں کی جھکی ہوئی کمر۔

مہرو کی آنکھوں میں امیدوں کے بجھتے چراغ۔ سب سے نظریں چرانے کا یہی راستہ تھا، جس پر وہ آنکھیں بند کر کے چل پڑا۔

شروع شروع میں کسی کو پتا ہی نہیں چلا، اور جب معلوم ہوا تو کافی دیر ہو چکی تھی۔

○ ○ ○

صالحہ کی خواہش کے مطابق خضر نے شہر کے صاف ستھرے علاقے میں بڑا سا گھر خریدا اور پھر اپنا بزنس سیٹ کرنے میں لگ گیا۔

اور......

صالحہ اسے جب فراغت نصیب ہوئی تو فطری طور پر اسے وہ گھر یاد آیا۔ جسے وہ چھوڑ آئی تھی۔ ماتا جی، پتا جی، راجیش بھیا یہاں تک کہ رام کاکا بھی یاد آئے، اور وہ سوچنے لگی کہ اس کی گمشدگی کو سب نے کیا نام دیا ہوگا۔ اور پتا نہیں کون کون سی کہانیاں سنا کر لوگوں کی۔ زبانیں بند کی ہوں گی اور کون جانے لوگوں کی زبانیں بند ہوئیں بھی کہ نہیں۔

انسانی فطرت ہے کہ وہ کبھی بھی آسودہ نہیں رہتا کسی نہ کسی بات کو لازمی طور پر اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے، اور پھر اس کے لئے جلنا کڑھنا خود اپنے نصیب میں لکھتا ہے۔ وہ بھی جب تک اس زندگی کے حصول کے لئے خضر کے ساتھ جدوجہد میں شامل رہی تب تک اسے چھوڑے ہوئے گھر کا خیال نہیں آیا۔ فقط ایک آسودہ زندگی کا تصور اور اس کے حصول کی کوشش ہی جیسے ان کی زندگی کا مقصود تھا۔ اور جب وہ مقصد پا لیا اور کرنے کو کچھ نہیں رہا تو پچھلے گھر کی خلش دل میں سر ابھارنے لگی۔

''میرے بعد کیا ہوا ہوگا......؟''

''کیسے اور کیونکر......؟''

''سب پر کیا بیتی ہوگی......؟''

''اور کیا سارا الزام خضر کے سر رکھا گیا ہوگا......؟''

ان باتوں نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ جب فارغ بیٹھتی یہی سب سوچا کرتی تھی۔

''کاش! میں راجیش بھیا کو اپنی خیریت سے آگاہ کر سکتی۔ اور انہیں یہ بھی بتا سکتی کہ میں یہاں اپنی مرضی سے آئی ہوں۔''

خضر بہت دنوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے یا تو کھو سی جاتی یا کسی گہری سوچ میں غرق ہو جاتی ہے۔ اس نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا، خیال تھا کہ وہ خود ہی کسی دن اس سے کہہ دے گی۔ لیکن کافی دن گزر گئے، وہ کچھ نہیں بولی جبکہ اس کے انداز اب بھی وہی تھے، اور وہ مزید صبر نہ کر سکا۔ تو پوچھ ہی بیٹھا۔

''کیا سوچا کرتی ہو......؟''

''کچھ نہیں......'' اس نے ٹالنا چاہا۔ مبادا وہ کچھ اور سمجھ بیٹھے۔

''نہیں کوئی بات ضرور ہے مجھے بتاؤ۔'' اس کے اصرار پر اس نے اپنے اندر اٹھتے سارے سوال دُہرا دیئے۔ وہ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر کہنے لگا۔

''تم راجیش کو خط لکھ دو۔''

''میں......''

''ہاں......! میں خود اس بارے میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ راجیش میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا کہ میں نے دوستی کی آڑ میں......''

''تمہارا دوش نہیں ہے۔'' وہ فوراً بول پڑی۔

''تو پھر اس کی نظروں میں مجھے نردوش ثابت کر دو۔''

''میں ایسا ہی کروں گی۔'' اس نے ہامی بھر لی۔

پھر اگلے کئی دن تک وہ خط لکھنے کے بارے میں سوچتی رہی اور یہ کہ کیا لکھے۔ سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا لیکن جب ایک رات لکھنے بیٹھی تو قلم خود بخود چل پڑا۔

پیارے راجیش بھیا......!

مجھے یہ خط بہت پہلے لکھنا چاہیے تھا لیکن تاخیر اس لئے ہوئی کہ سوچا جیون کی ناؤ کسی کنارے لگے تب اطمینان سے لکھوں گی اور اب جب اللہ کے فضل سے میں ہر طرف سے مطمئن ہوں تو آپ کو لکھ رہی ہوں، سب سے پہلے تو ماتا جی اور پتا جی کے بارے میں پوچھوں گی۔ ان کا کیا حال ہے۔ میری گمشدگی یقیناً آپ کے لئے معمہ ہوگی، اور اگر کوئی خیال آتا ہوگا تو صرف خضر بابو کا، کیونکہ اس رات وہی ہمارے گھر آئے تھے۔ اور یہ بات میرے علاوہ رام کاکا کو بھی معلوم تھی۔

اس رات حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے راجیش بھیا! کہ مجھے خود خضر بابو کو سب سے چھپا کر وہاں سے نکالنا پڑا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو وہ لوگ ہمارے گھر پر ہی انہیں ختم کر دیتے اور یہ بات تو آپ کو بھی گوارا نہ ہوتی۔

یقین کیجئے بھیا......! جب میں خضر بابو کو گاؤں سے نکال کر لے گئی، اس وقت تک میرے دل میں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ لیکن راستے میں جب ان کے تمام گھر والوں کی لاشیں دیکھیں اور خضر بابو کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تو اسی وقت میں نے ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا دل کسی طرح بھی انہیں تنہا چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوا، گو کہ خضر بابو مجھے اپنے ساتھ لانے پر آمادہ نہیں تھے، انہوں نے مجھے واپس بھیجنے کی بہت کوشش کی، لیکن میں فیصلہ کر چکی تھی، اور اب جب میں خضر کو ایک کامیاب انسان کے روپ میں دیکھ رہی ہوں تو مجھے اپنے فیصلے پر قطعی ندامت نہیں ہے۔ یقیناً وہ میری ہی بدولت اتنی جلدی اس مقام پر آئے ہیں۔ ورنہ تنہائی کے عذاب سے نکلنے کے لئے انہیں ایک عرصہ درکار تھا۔

میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ ہم نے یہاں آتے ہی شادی کر لی تھی، اور اب جبکہ ہماری شادی کو دو سال ہونے کو ہیں، ایک پھول احتشام کی صورت ہمارے آنگن میں کھل رہا ہے اور دوسرا......

آخر میں اتنا لکھوں گی کہ کبھی خضر بابو کا خیال آئے تو ان کی طرف سے دل برا مت کیجئے گا۔ کہ وہ نردوش ہیں۔ ماتا جی، پتا جی، اور رام کاکا کو سلام کہیے گا۔

فقط آپ کی

صالحہ بیگم (جو کبھی پوجا تھی)

خط بھیجتے ہی وہ انتظار کی صلیب پر لٹک گئی۔ ہر پل اس مخصوص دستک کی منتظر جو اسے راجیش بھیا کی طرف سے کسی سندیسے کی نوید دے۔ کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ یہاں تک کہ اس کی گود اور آنگن میں احتشام کے بعد حسام کی معصوم کلکاریوں کی مہک اڑ آئی۔ کچھ دن کے لئے وہ سب بھلا کر حسام میں مصروف رہی، پھر دونوں بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اور ان سے باتیں کرتے ہوئے اس قسم کے جملے اس کے منہ سے نکلنے لگے۔

''شام کے ماما جی کا خط آئے گا۔ وہ میرے شام کے بارے میں پوچھیں گے، اور ڈھیر سارا پیار بھی بھیجیں گے۔ پھر ہم انہیں لکھیں گے کہ شام کا ننھا بھائی حسام آیا ہے۔'' آخر میں سوچتی۔

پتا نہیں راجیش بھیا کا خط کیوں نہیں آیا۔ اور پھر نئے سرے سے انتظار شروع کر دیتی۔

''خضر......! راجیش بھیا نے میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا......؟'' اس روز وہ مایوس ہو کر اس سے کہنے لگی۔

''پریشان کیوں ہوتی ہو۔ کسی دن آ جائے گا۔''

''کب...... مجھے لکھے ہوئے ایک مہینہ سے زیادہ ہے۔''

''ہو سکتا ہے ڈاک کا نظام درست نہ ہو۔'' خضر نے بہلایا اور بہلنا اس کی مجبوری تھی۔

پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے راجیش کا خط آ گیا۔ اس نے بے تابی سے کھولا۔ بس چند لائنیں جو شاید گھسیٹی گئی تھیں۔

''تم نے جو کیا شاید اچھا ہی کیا۔ لیکن ہمارے لیے پوجا مر گئی اور کسی صالحہ کو نہ ہم جانتے ہیں نہ ہی اس سے رابطہ رکھنا چاہیں گے۔''

ایک بار دو بار وہ بار بار ان چند لائنوں کو پڑھتی گئی۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ راجیش بھیا نے ایسا لکھا ہے، وہ تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھی اور یہاں تو راجیش نے سارے ناتے ہی توڑ ڈالے تھے۔ اس کے دل میں درد سا ہونے لگا، اور آنکھیں جلنے لگیں۔ سارا دن وہ بے کل رہی اور وقفے وقفے سے دل کا درد آنکھوں کی راہ بہاتی رہی۔

شام میں خضر آیا تو وہ بہت حد تک اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی۔ پھر کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اس نے بہت خاموشی سے راجیش کا خط خضر کو تھما دیا۔ اس نے پڑھا اور فوری طور پر اس کی طرف سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اتنے اعتماد سے کھڑی ہے اس کے دیکھتے ہی ڈھے جائے گی۔

''پوجا مر گئی...... سنا تم نے خضر......! پوجا مر گئی۔''

وہ اسے مخاطب کر کے بلند آواز میں بولی اور ہنستی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آنکھوں سے پانی چھلکنے لگا تھا۔

○ ○ ○

فوری طور پر صالحہ کو احساس ہی نہیں ہوا کہ اس کی آنکھیں چھلک کر اس کا اندر عیاں کیے دے رہی ہیں۔ پھر جیسے ہی احساس ہوا وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم نادم ہو......؟'' خضر پوچھنے لگا۔

''قطعی نہیں...... پوجا کو میں نے خود مارا ہے۔ پھر کیوں نادم ہوں گی۔'' وہ فوراً ننھے حسام پر

جھک گئی تھی۔

کہانی تھی ختم ہوئی۔ اس کا جلنا کڑھنا سب ختم ہو گیا۔ ہاں ایک کسک سی دل میں ضرور تھی جو وہ جانتی تھی کہ اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ رہے گی۔ اس لئے اس نے اس سے سمجھوتا کر لیا تھا۔

خضر نے بزنس کی ابتدا کی تو یہاں بھی قسمت نے ساتھ دیا۔ اور وہ بہت جلد کاروبار کی دنیا میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گیا۔ کبھی کبھی جب وہ اپنے بارے میں سوچنے بیٹھتا تو اسے حیرت ہوتی۔ وہ اتنا ذمہ دار تو کبھی بھی نہیں تھا۔ شاید وقت اور حالات نے اسے بہت جلد اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ اور وقت ہی نے اسے بے تحاشا مصروف بھی کر دیا تھا۔

○ ○ ○

اماں حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھیں۔ لیکن حق نواز کے دوبارہ اس اقدام نے ان کے سارے حوصلے توڑ دیے۔ اب کسی موہوم سی امید کا سہارا بھی نہیں رہا تھا۔ مہر النساء کو دیکھتیں اور اندر ہی اندر کڑھتی رہتیں۔

وہ آج کل ایسی حالت میں تھی کہ اسے محبت اور توجہ کی ضرورت تھی۔ نواز سے تو امید نہیں تھی۔ وہ خود ہی اس کا خیال رکھنے کی کوشش کرتیں۔ ان کے اندر کہیں شاید یہ خیال بھی تھا کہ انہوں نے ایک بے سہارا لڑکی پر ظلم کیا ہے۔ گو کہ انہوں نے دانستہ ایسا نہیں کیا تھا۔ لیکن غیر دانستہ جو بھی ہوا اچھا نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ مہر النساء کبھی کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لائی تھی۔ اور نہ کبھی اپنے کسی عمل سے یہ ظاہر کیا کہ اس کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ اور شاید اس کی خاموشی ہی انہیں مارے ڈال رہی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ احتجاج کرتی یا انہیں الزام دیتی تو انہیں اتنا احساس نہ ہوتا۔ لیکن یہاں تو ہر بات کے جواب میں ایک مسلسل چپ تھی۔

''مہرو......! کچھ تو کہو بیٹی......!'' اماں نے اس سے التجا کر ڈالی۔

''کیا کہوں......!'' وہ الٹا انہی سے پوچھنے لگی۔

''مجھے الزام ہی دے ڈالو۔''

''نہیں اماں......!'' وہ ان کے پاس آ بیٹھی۔ ''آپ نے کیا کیا ہے جو میں آپ کو الزام دوں۔ اور پھر آپ خود کون سی سکھی ہیں۔ پہلے تو صرف بیٹے کے لئے کڑھتی تھیں۔ اب میں بھی آپ پر بوجھ بن گئی ہوں۔''

''تم بوجھ نہیں ہو۔''

''بوجھ ہی تو ہوں، اور کچھ دن بعد ایک اور وجود'' اس کا لہجہ بھیگ گیا۔ اور آواز ساتھ چھوڑ گئی۔

''ایسا مت کہو بیٹی۔ ہو سکتا ہے آنے والا وجود اس گھر کے لئے مبارک ثابت ہو۔ اللہ سے اچھی امید رکھو اور خیر کی دُعا کرو۔''

اماں نے مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے سے پہلے ایک اور امید کا دامن تھام لیا۔

''شاید کوئی بہتر صورت پیدا ہو جائے۔''

''نواز نے میرا اور مہرو کا خیال نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے بچے کی خاطر اپنی ڈگر چھوڑ دے۔''

''ہو سکتا ہے آزمائشیں یہیں تک ہوں۔''

اور آخر میں دُعا......

''کوئی گناہ، کوئی خطا جس پر تیری گرفت ہو مالک......! وہ سب بخش دے۔ مجھ دکھیاری پر رحم کر اور ان آزمائشوں سے نکال مجھے۔''

اور اوپر والے نے انہیں آزمائشوں سے ہی نہیں دنیاوی جھمیلوں سے بھی نکال لیا۔

وہ جو کبھی حوصلہ نہیں ہارتی تھیں۔ ایک کے بعد ایک ہمیشہ امید کا دامن تھامے رکھا۔ اپنی آخری امید دیکھنے سے پہلے ہی چلی گئیں۔ مہرو کے لئے یہ ایک سانحہ تھا۔ وہ اچانک اس بھری دنیا میں بالکل تنہا ہو گئی تھی۔ سر پر سائبان تو تھا لیکن وہ زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ رکھنے کا اہل نہیں تھا۔ اب بھی پچھلے دو دن سے وہ جانے کہاں کہاں غائب تھا۔ اماں کی تدفین سے سوئم تک سارا کام محلے والوں نے کیا۔ وہ اس کی راہ دیکھتی رہی تھی کہ کم از کم اس ماں کو کاندھا دینے تو آ جائے جس نے ساری عمر اس کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھایا تھا۔ لیکن شاید بدقسمت تھا وہ یا پھر اماں ہی خوش نصیب تھیں جو آخری وقت بھی اپنا بوجھ اس کے کاندھوں پر نہیں ڈالا۔

تین دن تک محلے کی عورتوں نے اس کی تنہائیوں کو بانٹا اور چوتھے دن اللہ میاں نے اس کی گود میں دو جڑواں بچے ایک ساتھ ڈال دیے۔ وہ حیران ہو کر باری باری دونوں کو دیکھے گئی اور سوچا۔

پتا نہیں، یہ قدرت کی طرف سے انعام ہے یا آزمائشوں کا کوئی نیا دور شروع ہونے والا ہے۔

اسی شام نواز آیا۔ حسب معمول اپنے آپ میں نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایسی حالت میں وہ کوئی بات نہیں سمجھتا۔ وہ تو سرے سے کچھ سننا ہی نہیں چاہتا۔ اس کے باوجود وہ پکار کر کہنے لگی۔

''کہاں تھے اتنے دن سے؟''

"کہیں نہیں۔" وہ چاہتا تھا چارپائی پر گر کر سو رہے اور وہ اس کا ارادہ بھانپ کر بولی۔

"تمہیں پتا ہے، تمہارے پیچھے یہاں کیا کچھ ہو گیا ہے۔"

"نہیں......"

"اماں مر گئیں۔" وہ ایک دم سے کہہ گئی۔

"اچھا......!" وہ شاید سمجھا نہیں تھا، اور جب سمجھا تو کتنی دیر تک گم صم کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر چارپائی پر ڈھے گیا۔ وہ خود اٹھنے کے قابل نہیں تھی۔ وہیں سے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ سیدھا لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔

"سنو نواز......!" اس نے مخاطب کیا تو وہ بھی وہیں سے گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔

"یہ بچے......!" اس نے اپنے برابر لیٹے بچوں کی طرف اشارہ کیا۔

"کس کے ہیں......؟" بے خیالی میں بولا۔

"ہمارے ہیں......"

"دونوں......" وہ اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا۔

"ہاں......!"

"لڑکے ہیں......؟"

"ایک بیٹا......ایک بیٹی۔"

"اچھا......!" بس ذرا دیر کو بچوں کو دیکھا پھر جا کر لیٹ گیا اور پھر کچھ ہی دیر بعد غافل بھی ہو گیا تھا۔

پھر اگلے چند دن تک وہ محلے کی خواتین کے رحم و کرم پر رہی۔ کوئی آ کر کھانا دے جاتی تو کوئی بچوں کو صاف ستھرا کر جاتی۔ جس دن وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئی۔ سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہ چند دن جو انہوں نے خیال رکھا تھا۔ یہی بہت تھا۔ ورنہ وہ کیا کر لیتی۔

اس دن وہ بہت پریشان تھی۔ گھر میں جو کچھ موجود تھا، وہ صبح ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے نواز سے کہا تو وہ یہ کہہ کر نکلا کہ میں کوئی انتظام کرتا ہوں۔ اور اب دوپہر کے بعد شام ہونے کو آئی تھی اور وہ نہیں آیا تھا۔ صبح ناشتا برائے نام ہی کیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک بھوکی تھی اور بچوں کو دودھ پلا کر تو وہ بالکل ہی نڈھال ہو چکی تھی۔

"کیا کروں......؟" وہ بار بار اپنے اجاڑ و ویران باورچی خانے کی طرف دیکھتی اور سوچتی کہ اٹھ کر جائے اور دیکھے شاید کوئی چیز مل جائے، لیکن وہاں تک جانے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تو وہ ادھر متوجہ ہو گئی۔ دستک کے بعد ایک خاتون اندر چلی آ رہی

تھی۔ وہ بغور دیکھنے لگی اور پھر اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔

"صالحہ......!"

"مہرو......! یہ تم ہی ہو ناں......؟" صالحہ اس کے قریب آ کر پوچھنے لگی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں......اور یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔" وہ کیا کہتی خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"اماں کہاں ہیں......؟" صالحہ نے پوچھا تو اس کی آنکھیں جو چھلکنے کو بے تاب تھیں، اسی بہانے چھلک پڑیں۔

"ارے......کیا ہوا......؟" صالحہ اس کے رونے سے پریشان ہوئی اور اس کے پاس آ بیٹھی۔ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے اماں کے انتقال کا بتایا۔

"مجھے اطلاع ہی نہیں دی کسی نے۔" صالحہ کو دکھ ہوا اور اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

"میں کیا کرتی......میری اپنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔" اس نے بچوں کی طرف اشارہ کیا تو صالحہ پہلی بار ادھر متوجہ ہوئی۔

"ارے جڑواں ہیں......"

"ہاں......!"

"اماں کے انتقال سے پہلے ہوئے یا بعد میں۔" وہ پوچھنے لگی۔

"بعد میں......"

"بیچاری اماں......کم از کم بچوں کو تو دیکھ جاتیں۔" پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"نواز کہاں ہے......؟"

"پتا نہیں......" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ صالحہ کچھ دیر تک خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

"سنو......! نواز کے بارے میں ادھر ادھر سے خبریں ملتی ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے کہ وہ دوبارہ......"

"ہاں......!" اس نے اعتراف کیا اور پھر رونے لگی صالحہ نے بمشکل اسے چپ کرایا۔ پھر اس کے لئے پانی لینے کچن میں چلی گئی۔ اور کچن کی حالت دیکھ کر ہی وہ بہت کچھ سمجھ گئی۔ واپس آ کر اسے پانی پلایا پھر پوچھنے لگی۔

"تم نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔"

"نواز لینے گیا ہے۔" اس نے اپنے گھر کی لاج رکھنی چاہی، حالانکہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ نواز

کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر چکی تھی۔

''ٹھہرو......! میں ڈرائیور سے کچھ منگواتی ہوں۔'' صالحہ اٹھنے لگی تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''نہیں صالحہ......! نواز بس ابھی آتا ہی ہوگا۔''

''اس کا انتظار فضول ہے......اور یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔''

صالحہ ہاتھ چھڑا کر چلی گئی۔ پھر ڈرائیور سے بات کر کے کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اس کے پاس آ بیٹھی۔ اور سمجھانے کے انداز میں کہنے لگی۔

''سنو مہرو......! میں تمہیں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ نواز کو چھوڑ دو، کیونکہ عورت کا گھر ایک ہی بار بستا ہے۔ وہ خواہ کیسا بھی ہے، تمہارا شوہر ہے۔ اور تمہیں اس گھر میں رہنا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ تم نے اسے سدھارنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ تم نے یقیناً اپنی سی ہر کوشش کر دیکھی ہوگی۔ اور اب جب وہ نہیں سدھرتا تو تم ہی کچھ کرو۔ کیوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر محض اس کی راہ تکتے رہنے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔ جب کہ یہ دو بچے بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ اور تمہاری ذمہ داری ہیں۔ تم انہیں بے آسرا یا حالات کے رحم و کرم پر تو نہیں چھوڑ سکتیں ناں......!''

''نہیں...... انہی کے لئے تو میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔''

''تو پھر حوصلے سے زندہ رہو۔ اماں کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ ایک حق نواز کی خاطر انہوں نے ساری زندگی اس آس میں گزار دی کہ کبھی تو وہ ان کے دلدر سمیٹے گا۔ اور یہ اماں کی بدنصیبی نہیں ہے مہرو کہ نواز نے ان کے دکھ نہیں سمیٹے، عورت تو پیدا ہی مرمٹنے کے لئے ہوتی ہے۔ کبھی ماں باپ کے لئے کبھی گھر کے لئے کبھی شوہر اور کبھی اولاد کے لیے۔ مرمٹنا بہرحال نصیب میں لکھا گیا ہے۔ ہاں بدنصیبی ہے نواز کی جس کا دامن ایک عظیم ماں کے دکھ سمیٹنے سے محروم رہ گیا۔ اور یقین رکھنا مہرو بقیہ تمام زندگی اس کے دامن میں کچھ نہیں سما سکے گا۔''

مہرو بے حد خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھے گئی تو وہ پوچھنے لگی۔

''تمہیں سلائی آتی ہے......؟''

''ہاں......!'' اس نے زبان کے ساتھ سر بھی ہلایا۔

''تو اب اماں کی جگہ تم سنبھال لو۔'' اس نے مشورہ دیا۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھو، اماں تو ممتا کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ تم کبھی اپنی محنت کی کمائی نواز کو مت دینا۔ اور لو، یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ کبھی ضرورت پڑے تو میرے پاس آ جانا یا مجھے بلا لینا۔ ویسے تو میں آتی رہوں گی۔ لیکن کیونکہ میری مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔ اس لئے میں احتیاطاً تم سے کہہ رہی ہوں کہ اگر کبھی میں نہ آ سکوں اور تمہیں ضرورت ہو تو۔''

دروازے پر دستک ہوئی۔ شاید ڈرائیور آ گیا تھا۔ صالحہ اٹھ کر چلی گئی۔ واپس آئی تو ڈرائیور اس کے پیچھے تھا۔ جو دونوں ہاتھوں میں تھیلے اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے ساری چیزیں کچن میں رکھوائیں پھر اسے باہر جانے کا کہا اور خود ایک تھیلی اور دو پلیٹیں لے کر اس کے آ بیٹھی۔

''آؤ...... پہلے کھانا کھا لیں۔''

''صالحہ......! یہ سب......'' وہ خاصی شرمندہ ہو رہی تھی۔ ''میں کوئی غیر نہیں ہوں مہرو۔ اس گھر اور اماں کے ناتے ہم دونوں ایک خاص بندھن میں بندھے ہیں......لو کھاؤ۔'' اس نے خود ہی نوالہ بنا کر اس کی طرف بڑھایا۔ اور پہلا نوالہ منہ میں کیا گیا کہ وہ کھاتی چلی گئی۔

''چائے بنا لاؤں صالحہ......؟''

''نہیں چائے رہنے دو میں پھر کسی وقت آ کر پی لوں گی۔ اس وقت بہت دیر ہو گئی ہے۔'' صالحہ اٹھ کھڑی ہوئی، پھر بچوں کے پاس آ کر کہنے لگی۔ ''انہیں تو میں نے ڈھنگ سے دیکھا بھی نہیں۔ کیا نام رکھا ہے دونوں کا۔''

''رابعہ اور فراز......''

''ماشاءاللہ...... بہت پیارے نام ہیں۔'' صالحہ نے کہا اور پرس میں سے کچھ روپے نکال کر رابعہ کی چھوٹی سی مٹھی میں بند کرنے لگی۔

''یہ مت کرو صالحہ......! تم نے پہلے ہی۔''

''میں تمہیں تو نہیں دے رہی۔'' اس نے پیار سے ڈانٹا اور پھر آنے کا کہہ کر چلی گئی۔

رات جب وہ فراغت بیٹھی تو اس نے خضر کو اماں کے انتقال کا بتایا۔ اور مہرو کا ذکر کر کے دیر تک اس کی حالت پر افسوس کرتی رہی تھی۔



وقت کا پہیہ اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا۔ صالحہ بیگم ابتدائی سات سالوں میں پانچ بچوں کو جنم دے کر اپنے گھر کو مکمل کر گئی۔ احتشام، حسام، نائلہ، انعام اور صبیحہ۔ یہ سب اس کی کائنات تھے۔ اور وہ اپنی کائنات کو سجانے سنوارنے میں بھرپور کردار ادا کر رہی تھی۔ دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینوی تعلیم میں وہ خود بچوں کے ساتھ شریک تھی کہ جو باتیں نہیں جانتی تھی وہ اب جان رہی تھی۔ دلچسپی بڑھی تو وہ اپنے طور پر بھی، اسلامیات کا مطالعہ کرنے لگی۔ اور پھر وہ جو ہے نا کہ تم

ایک قدم بڑھو اوپر والا دس قدم بڑھ کر تمہیں ملے گا۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ خدا کو شاید اس کی بھلائی منظور تھی کہ اگلے چند برسوں میں وہ ایک مکمل اور بھرپور عورت کے روپ میں سامنے آئی۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ نومسلم ہے۔ جس طرح وہ اللہ اللہ کا ورد کرتی تھی۔ اس سے تو لگتا تھا جیسے وہ ماں کے پیٹ سے یہ نام ساتھ لے کر آئی تھی۔ بے عیب صرف خدا کی ذات ہے۔ باقی انسان بظاہر ہر لحاظ سے مکمل ہونے کے باوجود کسی ایک پہلو سے ضرور ادھورا رہ جاتا ہے اور یہی خدا اور بندے میں واضح فرق ہے۔ صالحہ بیگم نے بھی گو کہ ہر لحاظ سے اپنی شخصیت کی تکمیل کر دی تھی۔ لیکن ایک پہلو جسے یا تو اس نے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ یا اسے خیال نہیں رہا تھا۔ اور وہ پہلو تھا۔ اس کا ہندوانہ رسم و رواج پر سختی سے کاربند رہنا۔ اس سلسلے میں خضر بھی اسے سمجھانے یا جبر کرنے سے معذور تھا۔ کیونکہ عام حالات میں بھی عورت "کم مانتی ہے اور زیادہ منواتی ہے۔" کے تحت مرد پر اپنی گرفت مضبوط رکھتی ہے۔ اور صالحہ بیگم کا پلڑا تو یہاں بھی بھاری تھا کہ وہ گھربار کے علاوہ اپنا دھرم تک خضر کی خاطر چھوڑ چکی تھی۔ اور پھر جس طرح اس نے اتنے بڑے گھر کو احسن طریقے سے چلانے کے ساتھ بچوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی تھی۔ وہ قابل ستائش تھی۔

اور مرد کو کیا چاہیے نیک اور صالح اولاد اور گھر کا سکون، تو یہ سب خضر کو میسر تھا۔ پھر وہ ایک ذرا سی بات کے لئے صالحہ سے کیوں الجھتا۔ اس کے برعکس جہاں وہ اس کا ممنون تھا۔ وہاں بچے بھی اسے بے جی بے جی کرتے نہ تھکتے تھے۔ اس نے شروع ہی سے بچوں کے ساتھ ایک مخصوص رویہ رکھا تھا کہ وہ بیک وقت اس کے قریب بھی تھے۔ اور دور بھی۔ قریب اس لحاظ سے کہ ذہنی ہم آہنگی اس حد تک تھی کہ وہ اپنی ہر بات ہر ضرورت بڑے اعتماد سے کہہ دیا کرتے اور اپنے مسائل دوستوں کی طرح ڈسکس کرتے تھے اور دوری یوں تھی کہ ایک حد سے آگے بھی نہ بڑھے تھے۔

وہ بے جا روک ٹوک نہیں کرتی تھی۔ لیکن آزادی بھی ایک حد تک ہی دے رکھی تھی۔ اس کے علاوہ سب بہن بھائیوں کو ایک مضبوط ڈوری میں باندھ رکھا تھا کہ کسی ایک کو تکلیف ہوتی تو دوسرا فوراً محسوس کر لیتا تھا۔

اس شام خضر آفس سے لوٹا تو اسے لان میں بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا۔ موسم بہار کی ابتدائی شامیں تھیں۔ کلیوں نے کھل کر لان کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ گو کہ تھکا ہوا تھا اور کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے اور بچوں کو لان میں دیکھ کر اندر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اس کے پاس چلا آیا۔ اس نے دیکھا اپنے بچوں کے علاوہ پڑوس کے بچے بھی موجود تھے اور وہ ان

کے کھیل میں کافی دلچسپی لے رہی تھی۔

"ہیلو......!" اس نے کہا اور پھر اس کے قریب نیچے ہری ہری گھاس پر بیٹھ گیا۔

"ارے......! اوپر بیٹھو ناں۔"

"نہیں میں ذرا ریلیکس ہونا چاہتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے کہنیاں گھاس پر ٹکا کر ٹانگیں سیدھی کر لیں۔

"تھک گئے ہو......؟" وہ پوچھنے لگی۔

"ہاں......! آج کچھ کام کا پریشر زیادہ تھا۔"

"چائے پیو گے......؟"

"ہاں......!" وہ اٹھنے لگی تو اس نے روک لیا۔

"شام سے کہو، وہ خانساماں سے کہہ آئے گا۔" پھر اس نے خود ہی احتشام کو آواز دے ڈالی۔

"جاؤ...... بیٹا......! خانساماں سے کہو۔ چائے یہاں لے آئے۔" شام بھاگتا ہوا اندر چلا گیا تو وہ دونوں بچوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ہرا سمندر گوبھی بندر
بول میری مچھلی کتنا پانی

نائلہ اچانک ابرار کا ہاتھ پکڑ کر سب کے درمیان سے نکلتی ہوئی خضر کے پاس چلی آئی اور کہنے لگی۔

"بابا......! دیکھیے میں نے ابرار کے ہاتھ پر راکھی باندھی ہے۔"

"کیا......؟" وہ چونکا اور سیدھا ہو بیٹھا۔

"ہاں بابا......! بے جی کہتی ہیں۔ یہ راکھی باندھنے سے اب ابرار میرا بھائی ہو گیا ہے۔ شام بھائی کی طرح۔"

نائلہ معصومیت سے بتا رہی تھی اور وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جو دونوں بچوں کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔

"بابا......! آپ کے ہاتھ پر بھی راکھی باندھ دوں پھر آپ بھی میرے بھائی ہو جائیں گے۔" وہ چھوٹی سی بچی ایسی ہی باتیں کر سکتی تھی۔

"نہیں بیٹا......! آپ جا کر کھیلو۔"

"آپ کے ہاتھ پر بے جی راکھی باندھیں گی۔"

وہ جاتے جاتے کہہ گئی اور اسے بے اختیار ہنسی آ گئی شرارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"میرے ہاتھ پر راکھی باندھو گی......؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی تو اسے بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

"صالحہ......! کیا تم نہیں جانتیں کہ ہمارے ہاں راکھی کا کوئی تصور نہیں ہے۔"

"جانتی ہوں۔"

"پھر بھی تم نے......"

"مجھے یہ رسم اچھی لگتی ہے خضر......! اور میں اسے چھوڑ نہیں سکتی۔"

وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

"مت چھوڑو لیکن پلیز اسے سنجیدگی سے مت لینا۔"

"کیا مطلب......؟"

"مطلب سمجھانے سے پہلے میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ ان بچوں کو دیکھو۔ آج یہ چھوٹے ہیں، کل بڑے ہوں گے۔ فرض کرو نائلہ اور ابرار کے درمیان۔ انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہو جاتی ہے، اور جب شادی کی بات آئے گی۔"

"یہ قطعی ناممکن ہے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً بول پڑی۔

"کیوں......؟"

"اس لئے کہ نائلہ اس کے ہاتھ پر راکھی باندھ چکی ہے۔"

"اسی لئے میں کہہ رہا ہوں کہ اسے سنجیدگی سے مت لو۔ ہمارے مذہب میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"میں تمہارے مذہب میں پورے خلوص اور نیک نیتی سے شامل ہوئی ہوں خضر! تم پلیز چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر مجھ پر شبہ مت کرنا۔ میں جانتی ہوں مذہب میں راکھی کا کوئی تصور اور اہمیت نہیں ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی برائی بھی نہیں ہے۔ جو میں کروں گی۔ اور گرفت میں آ جاؤں گی۔"

"تم شاید دو کشتیوں میں سوار ہو۔"

"نہیں، تمہاری کشتی میں پاؤں رکھتے ہی میں نے اپنی کشتی کو وہیں چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر اسے ڈوبتے ہوئے ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تم گواہ ہو خضر اور گواہ رہنا۔"

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر اندر کی طرف چل پڑی اور وہ وہیں بیٹھا اسے جاتے ہوئے دیکھتا

رہا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ دو متضاد کیفیات میں گھر گیا ہے کہ مطمئن بھی ہے اور الجھتا بھی جا رہا ہے۔

○ ○ ○

شام کا وقت تھا۔ مہر النساء ابھی تک مشین پر جھکی ہوئی تھی۔ پانچ سالہ رابعہ اور فراز قریب ہی فرش پر بیٹھے کھیل رہے تھے۔ دونوں بچے جب ان کی ماں کام کر رہی ہوتی تو کبھی اسے تنگ نہیں کرتے تھے شاید حالات نے انہیں اتنی سی عمر میں یہ بات سمجھا دی تھی کہ جب تک ان کی امی مشین پر بیٹھی رہیں گی، تب تک ان کے پیٹ کو روٹی ملتی رہے گی، ورنہ مشین بند ہوتے ہی روٹی ملنا بھی بند ہو جائے گی۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" فراز نے سرگوشی میں رابعہ سے کہا۔

"چپ کرو، ابھی امی اٹھیں گی تو روٹی پکا دیں گی۔" رابعہ آہستہ آواز میں اسے سمجھانے لگی۔

اور وہ جو مشین کی گھرر گھرر سے نکل کر اب ہاتھ سے کام لگی تھی بچوں کی سرگوشیوں پر تڑپ اٹھی اور جلدی جلدی سارے بکھرے ہوئے کپڑے سمیٹ کر ایک طرف رکھنے لگی۔

"کام ختم ہو گیا امی......!" فراز بے تابی سے پوچھنے لگا۔

"نہیں بیٹا......! پہلے روٹی پکا لوں۔ بقیہ کام رات میں کر لوں گی۔"

اس نے کہا اور ابھی اٹھی ہی تھی کہ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور حق نواز اپنے مخصوص انداز میں جھومتا جھامتا اونچی آواز میں گالیاں بکتا ہوا اندر چلا آیا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ جبکہ دونوں بچے سہم کر اٹھے اور کونے کھدروں میں پناہ ڈھونڈنے لگے۔

"مہرو......! اے مہرو......! وہ پکارنے لگا۔ حالانکہ وہ سامنے کھڑی تھی۔

"الو کی پٹھی کہاں مر گئی ہے۔"

پھر اس کی زبان سے روانی سے گالیاں نکلنے لگیں۔ وہ تاسف سے دیکھے گئی۔ جب تک اماں زندہ تھیں۔ وہ کم از کم ایسی زبان تو استعمال نہیں کرتا تھا۔ ان کے ساتھ ہی سارا لحاظ بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر سہمے ہوئے بچوں کو دیکھا پھر آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"کیوں چلا رہے ہو......؟" وہ آہستہ آواز میں پوچھنے لگی۔

"تو کہاں چلی گئی تھی......؟"

"کہیں نہیں...... یہیں تمہارے سامنے ہی تو کھڑی تھی۔ تمہیں نظر کیوں نہیں آتا۔"

''اچھا اچھا......! سن میں تیرے لئے ایک خوشخبری لایا ہوں۔''

''خوشخبری......!'' اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ اور وہ ایک ٹک اسے دیکھے گئی۔

''پتا ہے...... مجھے بہت بڑا کام مل گیا ہے...... ٹھیکے پر۔'' وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بتانے لگا۔ جب کہ اس نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے ایسی ہی باتوں میں بہلا کر پھر اپنے اصل مقصد کی طرف آئے گا۔ شروع شروع میں وہ واقعی بہل جایا کرتی تھی۔ لیکن اب وہ اسے اچھی طرح سمجھنے لگی تھی۔ اس لیے خاموشی سے کھڑی تھی۔ جب کہ وہ کہہ رہا تھا۔

''اتنے بڑے کام میں ہاتھ تو ڈال دوں لیکن سارا مسئلہ پیسوں کا ہے۔ اگر تھوڑے بہت کا بھی انتظام ہو جائے تو۔''

اس کا دل چاہا کہہ دے پہلے پیسوں کا انتظام کرو پھر کام میں ہاتھ ڈالنا۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔

''تمہارے پاس کتنے ہیں......؟'' وہ گھما پھرا کر پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں...... میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ میں تو خود تمہاری آس پہ بیٹھی ہوں۔''

''جھوٹ بکتی ہے۔ سارا سارا دن جو مشین پر بیٹھی رہتی ہے۔ اس کے پیسے کہاں جاتے ہیں۔'' وہ طیش میں آنے لگا۔

''تم تو ایسے پوچھ رہے ہو، جیسے گھر کا خرچ تم چلاتے ہو۔'' اس کا اتنا کہنا غضب ہو گیا۔

''ذلیل کی بچی......!'' زبان کے ساتھ اس نے ہاتھ بھی چلانا شروع کر دیا۔

''نکال جو کچھ ہے تیرے پاس، ورنہ ابھی ختم کر دوں گا۔''

وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تو اسے مزید طیش آیا۔ بڑھ کر فراز کو کھینچ لیا۔

''مت دے...... میں اسے ہی گروی رکھ آتا ہوں۔''

''نواز......!'' وہ چیخی اور لپک کر فراز کو اس سے چھیننا چاہا لیکن اس نے فوراً فراز کو اپنے پیچھے کر لیا۔

''یوں نہیں پہلے پیسے نکال......'' وہ بے بس تھی۔ مجبور ہو گئی، جو کچھ پاس تھا۔ اس کے حوالے کر دیا۔

''مجھ سے چھپاتی ہے۔'' اس نے پیسے مٹھی میں دبائے، پھر فراز کو اس کی طرف دھکا دے کر شاطرانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے جس طرح سے آیا تھا اسی طرح واپس چلا گیا۔

''فراز......!'' اس نے فراز کو بازوؤں میں بھینچا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''امی......!'' رابعہ نے آ کر اپنے چھوٹے ہاتھوں سے اس کے کندھے تھام لیے۔ ''ابا چلے گئے ہیں اب آپ نہ روئیں۔'' وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑنے لگی۔ بچے بیچارے خاصے آزردہ نظر آ رہے تھے۔ وہ ان کی خاطر فوراً اٹھی، اور منہ ہاتھ دھو کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ دونوں بچے اس کے پیچھے آ گئے تو اس نے انہیں چوکی پر بٹھایا۔ پھر روٹی ڈالنے لگی۔

''امی......! ابا یہاں کیوں آتے ہیں......؟'' فراز معصومیت سے پوچھنے لگا۔

''بیٹا......! یہ ان کا گھر ہے۔ وہ یہاں نہیں آئیں گے تو کہاں جائیں گے۔'' وہ سمجھانے لگی۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بچے اپنے باپ سے متنفر ہو جائیں۔

''مجھے ان کا آنا اچھا نہیں لگتا۔'' رابعہ نے منہ بنا کر کہا۔ ''جب بھی آتے ہیں، امی کو مارتے ہیں۔''

''ہاں......! بہت خراب ہیں مجھے ابا اچھے نہیں لگتے۔''

''بری بات بیٹا......! ایسے نہیں کہتے'' اس نے ٹوکا اور ان کا دھیان بٹانے کی خاطر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ پھر اس نے وہیں بیٹھ کر دونوں کو کھانا کھلایا خود بھی کھایا۔ پھر انہیں اندر جانے کا کہہ کر برتن دھونے لگی۔

بچوں کے سامنے وہ اپنے سارے زخم چھپائے بیٹھی تھی۔ اب تنہائی ملی تو ایک ایک کر کے سب رسنے لگے۔

''پتا نہیں...... کیسی ہوتی ہیں وہ لڑکیاں میکے کے نام پر ایک تحفظ، ایک مان، ایک زعم نصیب ہوتا ہے۔'' اس نے سوچا اور آنکھوں میں برسات اتر آئی۔ کتنی دیر تک وہ وہیں بیٹھی چپ چاپ روتی رہی پھر غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا تو اسے بچوں کا خیال آیا۔ فوراً اٹھ کر اندر آ گئی۔ وہ دونوں بہت خاموشی سے اپنی اپنی تختیاں لکھنے میں مصروف تھے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور کہنے لگی۔

''میں بھی تم دونوں سو گئے۔''

''کام کر کے سوئیں گے۔'' رابعہ نے جواب دیا۔

''صبح کر لینا بیٹا......! اب سو جاؤ۔''

''نہیں امی......! پہلے کام کریں گے۔ آپ ہی تو کہتی ہیں کہ میں پڑھ لکھ کر ہی بڑا آدمی ہوں گا۔''

فراز اسی کی بات دہرا رہا تھا۔ وہ گھٹنے فرش پر ٹیک کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"ہاں بیٹا...... ! تم نواز کی طرح اپنا دامن خالی مت رہنے دینا۔ میرے سارے دکھ سمیٹ لینا۔"

فراز پتا نہیں اس کی بات سمجھا یا نہیں لیکن پوچھنے لگا۔

"کیسے امی......؟"

"اچھے انسان بن کر جب تم اچھے اور بڑے آدمی بن جاؤ گے، تو میرے سارے دلدر آپ ہی آپ دُور ہو جائیں گے۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ تم دل لگا کر پڑھنا اور رابعہ کو بھی پڑھانا۔"

وہ تصور کی آنکھ سے بہت دور تک دیکھنے لگی تھی۔

"امی...... ! کیا میں بھی بڑا آدمی بنوں گی......؟" رابعہ کی بات پر وہ مسکرائی۔

"تم بڑی آدمی بنوگی۔" اس نے تھپکی کی پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

"چلو اب تم دونوں سو جاؤ۔"

"آپ نہیں سوئیں گی......؟"

"میں بھی سو رہی ہوں۔" اس نے چارپائیوں پر بستر ٹھیک کیے ایک پر ان دونوں کو لٹایا پھر خود بھی لیٹ گئی۔

وقت کا کام گزرنا ہے۔ جنہیں سب میسر ہوتا ہے۔ انہیں وقت بھاگتا ہوا لگتا ہے۔ اور محرومیوں کا شکار ہونے والوں کے لئے یہی وقت رینگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مہرو کے لئے وقت اگر رینگ رہا تھا تو وہ گزر رہا تھا۔ موسم آتے اور اپنی شدتیں اس کے لیے چھوڑتے ہوئے چلے جاتے۔ وہ بہت زیادہ باحوصلہ نہیں تھی۔ پھر بھی موسموں کی شدتیں تنہا اپنی ذات پر سہہ رہی تھیں۔ بچوں کو بہر حال وہ محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ آنے والے وقت سے بہت زیادہ پرامید نہیں تھی۔ نواز کی دن بدن بڑھتی ہوئی بے راہ روی اور ہر دوسرے دن پیسوں کے مطالبے کے ساتھ آنا۔ گالم گلوچ اور مار پیٹ نے ہی اسے مایوس کیا تھا۔ وہ اکثر سوچتی۔ یہ اماں کا ہی حوصلہ تھا جو وہ آخری وقت تک پرامید رہیں۔

"شاید کوئی معجزہ ہو جائے یا اللہ میاں کو مجھ پر رحم آ جائے۔" دل آس دلانے کی کوشش کرتا۔ لیکن اسے معجزے کا یقین نہیں تھا۔ البتہ بچوں کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ تھوڑی پرامید ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن یہاں اسے ایک اور وہم پریشان کرتا۔ پتا نہیں وہ اس وقت تک اپنی زندگی کو کھینچ بھی سکے گی یا نہیں۔

اور یہ وہم اس کی گرتی ہوئی صحت نے اسے بخشا تھا۔ بظاہر اتنی کمزور نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن

اندر سے وہ بالکل کھوکھلی ہو چکی تھی۔ اور اپنے کھوکھلے پن کو صرف وہ خود ہی محسوس کر سکتی تھی۔ جانتی تھی کہ وہ ریت کی ایسی بوسیدہ دیوار کی مانند ہو چکی ہے۔ جو ذرا سی تیز ہوا سے زمین بوس ہو جاتی ہے۔

اسی طرح حالات کی چکی میں پستے پستے دو سال اور گزر گئے۔ وہ چاہتی تھی کسی طرح وقت کو پر لگا کر بچوں کو جوانی کی دہلیز پر لا کھڑا کرے۔ لیکن یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ ابھی تو بچے صرف تیسری جماعت میں ہی آئے تھے۔ کلام پاک اس نے خود انہیں ختم کروا دیا تھا۔

اس روز حق نواز آیا تو قدرے بہتر حالت میں تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کیں پھر کہنے لگا۔

"مہرو...... ! میں شادی کر رہا ہوں۔"

"کیا......؟" اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"ہاں...... ! مجھے ایک بیوی ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ جب کہ تم تو مشین کے ساتھ رہ کر خود بھی مشین بن گئی ہو۔"

"حق نواز......!" وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ "مجھے مشین کس نے بنایا ہے۔ جس مشین سے میں نے ناتا جوڑا۔ اس کی بدولت تو اس گھر کی گاڑی چل سکی۔ بلکہ تم بھی اپنا حصہ حق سمجھ کر وصول کرتے رہے۔ جب کہ تم سرے سے حقدار ہی نہ تھے۔" لیکن وہ خاموش کھڑی اس کی طرف دیکھے گئی۔

"کچھ کہو گی نہیں۔"

"میں کیا کہوں......؟" وہ آہستہ سے بولی۔

"کچھ بھی......"

"صرف اتنا بتا دو، اسے کھلاؤ گے کہاں سے۔"

"ارے...... ! وہ زور سے ہنس پڑا۔" کھلانے والا اللہ ہے۔ اور پھر وہ تمہاری طرح نہیں ہے۔ دو مکان ہیں اس کے پاس ...... ہیں تو چھوٹے، لیکن پھر بھی گزارے کے لیے کافی ہیں۔ ایک میں رہیں گے......دوسرے کا کرایہ کھائیں گے۔"

"تو یوں کہو، اس کے مکانوں سے شادی کر رہے ہو۔" خلاف توقع وہ اس کی بات پر ہنستا رہا۔

"کیا وہ تم سے شادی پر رضامند ہے......؟" وہ کسی خیال کے تحت پوچھنے لگی۔

"کیوں مجھ میں کیا کمی ہے......؟"

"کمی تو کوئی نہیں...... میں بس یونہی پوچھ رہی تھی۔" وہ دل پر جبر کر کے بولی۔

"ہاں......! وہ رضامند ہے۔ بلکہ اس نے خود ہی شادی کی پیشکش کی ہے۔ اصل میں وہ بیوہ ہے۔ ایک لڑکا بھی ہے، جو میرا خیال ہے، تمہارے بچوں سے کچھ بڑا ہے۔"

"تمہارے بچوں سے......" اسے شدید جھٹکا لگا۔ تو کیا یہ صرف میرے بچے ہیں۔ اس کا کوئی حق نہیں۔ وہ اس کی حالت سے بے خبر اپنی کہنے لگا۔

"کیونکہ خاصی قبول صورت عورت ہے اور ایک طرح سے صاحب جائیداد بھی۔ اس لیے اپنے آپ کو محفوظ تصور نہیں کرتی۔ دوسرے بچے کی طرف سے بھی خاصی پریشان ہے کہ سر پر باپ نہیں ہے تو کہیں غلط راستے پر نہ چل نکلے۔ میں نے سوچا یتیم بچہ ہے۔ سر پر ہاتھ رکھ دوں گا۔ تو ثواب ہی ملے گا۔"

"میرے خدا......!" نہ آسمان گرا تھا۔ نہ زمین زلزلوں کی زد میں آئی تھی، پھر کیوں اسے ہر چیز گردش کرتی نظر آ رہی تھی۔ اور پھر آنکھوں کے سامنے دھندسی چھانے لگی اور دھندلکوں کے اس پار وہ شاید جا رہا تھا۔

"امی......! امی......!" رابعہ، فراز اس کے دائیں بائیں آ کھڑے ہوئے "چلے گئے، امی ابا چلے گئے۔" وہ دونوں اس کے ہاتھ ہلاتے ہوئے بتانے لگے۔

"اچھا......!" وہ طویل سانس لیتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی۔ جب کہ دل یہ چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر ساری دنیا کو اکٹھا کر لے اور کہے۔

"آؤ دیکھو...... مجھ حرماں نصیب کا تماشا......!"

"میں نواز کی ذمہ داریاں اپنے کاندھوں پر اٹھانے کی سزاوار ہوں، جبھی تو وہ میرے سر مشین بننے کا الزام رکھ رہا ہے۔"

"اور......"

"دیکھو......! اسے جو اپنے فرائض سے غافل ہو کر بھی سرخرو جا رہا ہے۔"

"اپنے بچوں کے سر سے دست شفقت کھینچ کر دوسرے کی یتیمی کا درد لیے جا رہا ہے۔"

"خود اس کے بچے جو باپ کے ہوتے یتیم ہو رہے ہیں، انہیں اس یتیمی کے احساس سے کون نکالے گا۔"

"کوئی نہیں ہے جو اسے روک سکے۔"

"کوئی نہیں ہے۔" وہ ہلکے ہلکے بڑبڑانے لگی تھی۔ رابعہ نے پریشان ہو کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"امی......! ابا نے تو آپ کو نہیں مارا پھر کیوں رو رہی ہیں۔" رابعہ کے پوچھنے پر اسے احساس ہوا کہ اس کے آنسو بڑی روانی سے بہہ رہے ہیں۔ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر رابعہ کی طرف دیکھا۔ پھر دونوں بچوں کو ایک ساتھ اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"ٹھیک کہہ گیا ہے، وہ کہ تم میرے بچے ہو۔"

"ہاں......! تم صرف میرے بچے ہو۔" اس کے سینے میں ہلکا ہلکا درد کروٹیں لینے لگا۔ تو وہ سختی سے ہونٹ بھینچ گئی۔

رابعہ اور فراز کی خاطر زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اور انہی کی خاطر اس نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن شاید چوٹ شدید تھی، جس نے اسے چور چور کر دیا تھا کہ ساری کوششیں۔ ناکام ہو گئیں اور وہ چارپائی سے لگ گئی۔

حق نواز اس دن کے بعد سے نہیں آیا تھا۔ شاید وہ اپنی نئی دنیا بسا کر اس میں مگن ہو گیا تھا۔ اب اس مقام پر اسے نواز کا خیال نہیں تھا۔ اور نہ ہی یہ دکھ کہ وہ اسے بیچ منجدھار میں چھوڑ گیا تھا۔ اب تو صرف یہ وہم پریشان کرتا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو اس کے بعد بچوں کو کون دیکھے گا۔

"اس بھری پری دُنیا میں کون ہے ایسا......؟" اس نے سوچا اور اسے صالحہ کا خیال آیا۔ لیکن وہ اس قابل نہیں تھی کہ اس کے پاس جا کر اپنے بچوں کے لیے امان مانگتی۔ اس نے سوچا وہ صبح عرفان کو بلوا کر اسے صالحہ کے گھر کا پتا دے کر بھیجے گی کہ اسے بلا لائے۔

رات اس کے لیے بہت بھاری تھی۔ سینے کا درد ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

"میرے خدا......! کچھ وقت اور کہ میں بچوں کا کوئی ٹھکانا کر سکوں۔"

وہ مسلسل اوپر والے سے مہلت مانگتی رہی یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ اس نے فراز کو آواز دی تو اس کے ساتھ رابعہ بھی اٹھ بیٹھی۔

"جاؤ بیٹا......! تم دونوں منہ ہاتھ دھو لو۔"

"امی......! آپ کا بخار نہیں اُترا......؟" رابعہ پوچھنے لگی۔

"نہیں......"

"پھر آپ لیٹی رہیں۔ میں چائے بھی بنا لوں گی۔"

"خیال سے بنانا بیٹی......! اور چولہا بھی خیال سے جلانا۔"

پھر اس نے تکیے کے نیچے سے دو روپے نکال کر فراز کو دیے کہ جا کر پاپے لے آئے۔ دونوں بچے اٹھ کر چلے گئے تو وہ جو رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ اسے نیند آنے لگی۔ اور پھر شاید وہ سو بھی گئی تھی کہ رابعہ نے آ کر اٹھایا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کی امی رات ایک پل کے لئے بھی نہیں سو

سکیں تو وہ کبھی نہ اٹھاتی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی۔

"امی......! آپ بھی ہمارے ساتھ پاپے کھالیں۔"

"نہیں بیٹا میرا دل نہیں چاہ رہا۔ ہاں ایک پیالی چائے دے دو۔" وہ تکیے کے سہارے ذرا سا اونچی ہو بیٹھی۔ رابعہ نے چائے لا کر دی تو وہ گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

پھر جب بچے ناشتے سے فارغ ہو گئے تب وہ فراز سے کہنے لگی۔

"جاؤ بیٹا......! عرفان چاچا کو بلا کر لے آؤ۔"

"کیوں امی......!"

"مجھے ان سے کام ہے۔ جاؤ جلدی کرو شاباش۔"

فراز مزید کوئی سوال کیے بغیر عرفان کو بلانے چلا گیا۔ جب کہ رابعہ اس کے پاس آ بیٹھی۔ وہ چھوٹی سی لڑکی، اسے بس اتنا احساس تھا کہ اس کی امی بیمار ہیں۔ اور وہ ان کی دلجوئی کی خاطر اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ وہ بظاہر دلچسپی سے رابعہ کو سن رہی تھی لیکن اس کا سارا دھیان فراز کی طرف تھا کہ کب وہ عرفان کو لے کر آتا ہے۔

فراز کو اکیلے آتے دیکھ کر ہی مہرو سمجھ گئی تھی کہ عرفان نہیں ملا ہوگا۔ اس کے باوجود پوچھنے لگی۔

"کیا ہوا بیٹا عرفان......! چاچا نہیں آئے......؟"

"وہ نہیں ہیں۔"

"تم نے انہیں کہاں دیکھا......؟"

"میں ان کے گھر گیا تھا امی! ان کے بیٹے نے بتایا ہے۔ وہ کراچی گئے ہوئے ہیں۔"

فراز نے بتایا تو وہ بے تابی سے پوچھنے لگی۔

"کب آئیں گے کراچی سے......؟"

"پتا نہیں......"

"تم نے پوچھا نہیں تھا......؟" فراز نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے مایوس ہو کر سر تکیے پر ٹکا دیا۔

"اب کیا کروں اور کس سے کہوں۔"

وہ سوچنے لگی۔ لیکن کوئی بھی نام اس کے ذہن میں نہیں آیا۔ ویسے بھی وہ صرف عرفان سے واقف تھی جب سے اس گھر میں آئی تھی اس نے صرف عرفان ہی کو کبھی کبھار آتے دیکھا تھا۔ وہ بھی اس وقت جب تک اماں رہیں۔ اماں کے بعد تو وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ اور وہ خود بھی اس گھر کی چار دیواری سے نکلی نہیں تھی۔ اگر وہ بہتر حالت میں ہوتی تو خود ہی بچوں کو لے کر صالحہ کی تلاش میں نکل

کھڑی ہوتی۔ لیکن وہ اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کر رہی تھی۔

"مجھے ذرا ہمت سے کام لینا چاہیے ورنہ بچے......"

اور بچوں کا خیال کر کے ہی وہ اٹھی۔ چارپائی سے اتری تو سر میں بڑی زور کا چکر آیا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ دوبارہ بیٹھ گئی اور ابھی اپنی بے بسی پر آنسو بہانا ہی چاہتی تھی کہ صالحہ آ گئی۔ شاید خدا کو اس پر رحم آ گیا تھا۔ ویسے بھی جب بندہ ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو وہ کوئی معجزہ دکھا کر اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ اور یہ معجزہ ہی تو تھا کہ اس کی بے آواز صدائیں صالحہ کو کھینچ لائی تھیں۔ وہ صالحہ کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

"مہرو......! اس طرح مت روؤ......دیکھو......! بچے پریشان ہو رہے ہیں۔" صالحہ آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ تھپکتی رہی۔ اسے سنبھلنے میں کافی دیر لگی۔ شاید دل کا سارا درد اور غبار آنکھوں کی راہ بہا کر ہی وہ سنبھل پائی تھی۔

"مجھے بتاؤ کیا بات ہو گئی ہے......؟" وہ آرام سے بیٹھی تو صالحہ پوچھنے لگی اور فوری طور پر وہ کچھ بول نہ سکی۔

"یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے۔ کوئی پریشانی کی بات تھی۔ تو مجھے بلوا لیتیں۔"

"میں تمہیں بلوانا چاہتی تھی صالحہ......! لیکن کوئی ایسا بندہ نہیں تھا جسے تمہارے پاس بھیجتی۔"

"چلو......اب تو میں آ گئی ہوں اب بتاؤ کیا بات ہے......؟" صالحہ نے محبت سے پوچھا تو پہلے اس نے نواز کی دوسری شادی کے بارے میں بتایا۔ پھر اپنے وہم کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"مجھے لگتا ہے۔ میں اب زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکوں گی کیونکہ میرے سینے کا درد ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے اور یہ درد میری جان لے کر ہی رہے گا۔"

"ایسا نہ کہو مہرو......! تمہیں ابھی بچوں کی خاطر زندہ رہنا ہے۔" صالحہ نے حوصلہ دینا چاہا۔

"انہی بچوں کی خاطر تو میں تمہیں بلانا چاہتی تھی۔ میرے بعد کوئی نہیں ہے جو ان کے سر پر ہاتھ رکھے ایک تم ہی ہو جو......"

"مایوسی کی باتیں مت کرو۔" صالحہ نے ٹوک دیا۔ "چلو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔"

"نہیں صالحہ......!"

"کیسے نہیں...... چلو اٹھو۔" اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود صالحہ نے زبردستی اسے اٹھایا اور پھر بچوں کو بھی ساتھ لیا اور گاڑی میں ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ صالحہ کے کہنے پر ڈاکٹر نے اس کا مکمل چیک اپ کیا۔ پھر آ کر اس سے پوچھنے لگا۔

"بیگم حیات...... ! یہ خاتون آپ کی کون ہیں؟"

"اسے میری بہن ہی سمجھئے ڈاکٹر صاحب......!" ڈاکٹر کچھ دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر نفی میں سر ہلانے لگا۔

"کیوں کیا ہوا......؟" وہ پریشانی سے پوچھنے لگی۔

"یہ عورت اندر سے بالکل تباہ ہو چکی ہے۔ گردے، پھیپھڑے، بالکل ناکارہ ہو چکے ہیں اور اب تو دل۔"

"پلیز ڈاکٹر......!" وہ فوراً بول پڑی۔ "اسے ابھی زندہ رہنا چاہیے، اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"میں میڈیسن لکھ دیتا ہوں۔ پابندی سے استعمال کرائیں۔ اور ہاں انہیں آرام کی بہت سخت ضرورت ہے۔"

"آرام اس کے نصیب میں کہاں۔" وہ بلا ارادہ ہی کہہ گئی۔

"آرام نہیں کریں گی تو کوئی دوا اثر نہیں کرے گی۔"

ڈاکٹر نے نسخہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو اس نے خاموشی سے پرچہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر واپسی میں وہ دوائیں اور کچھ پھل وغیرہ لیتی ہوئی آئی تھی۔ گھر میں آتے ہی اس نے مہرو کو لٹا دیا۔ اور تاکید کرنے لگی۔

"دیکھو...... ! دوا وقت پر لینا۔ اور اب تمہیں کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جتنا ہو سکے آرام کرو۔ لاپروائی کرو گی تو اپنا ہی نقصان ہوگا۔ اور نقصان کیا ہے تم تو چپ چاپ مر جاؤ گی۔ پیچھے تمہارے بچے رل جائیں گے۔"

آخر میں وہ اس کی شہ رگ پر ہاتھ رکھ گئی تھی۔

"میں لاپروائی نہیں کروں گی صالحہ! لیکن یہ تو سوچو اگر کام نہیں کروں گی تو......"

"کون سا کام......؟" صالحہ اس کی بات کاٹ کر پوچھنے لگی۔

"مشین کا......"

"خبردار جب تک مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جاتیں۔ مشین پر بیٹھنے کی کوشش مت کرنا۔ اور تمہیں گھر کے خرچ کی فکر ہے ناں وہ میں۔"

"نہیں صالحہ......!" وہ فوراً بول پڑی۔ "مجھ پر اتنے احسان مت کرو۔"

"میری محبت اور خلوص کو احسان کا نام دے رہی ہو۔" صالحہ نے شکوہ کیا۔ پھر کہنے لگی۔

"میں تم پر احسان نہیں کر رہی ہوں مہرو! بلکہ اس عورت کے احسان عظیم کا بدلہ چکانے کی کوشش کر رہی ہوں جو پہلے مجھے اور پھر تمہیں اس گھر میں لائی۔ حالانکہ میں زندگی بھر اس کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتی خواہ میں کچھ بھی کر لوں۔ ذرا سوچو۔ جب ہم نے اس سرزمین پر قدم رکھا تو کون تھا ہمارا۔ انہوں نے ہی نہ صرف ہمارے سر پر دست شفقت رکھا بلکہ گھر میں بھی جگہ دی۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

"سنو......! تم اگر اماں کے احسان کا بدلہ چکانا چاہتی ہو تو میرے بعد ان بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ دینا کہ یہ انہی کا خون ہیں۔"

"میں تمہاری تسلی کی خاطر وعدہ کرتی ہوں کہ ایسا ہی کروں گی لیکن خدا کے لیے مایوس مت ہو اور نہ ہی حوصلہ ہارو۔ بچوں کو جو محبت اور توجہ تم دے سکتی ہو، وہ میں ہزار کوشش کے باوجود بھی نہ دے سکوں گی۔"

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"میرا خیال ہے تم نے اس بات کا زیادہ اثر لیا ہے کہ نواز نے شادی کر لی۔ اور تم ہی کیا تمہاری جگہ کوئی بھی عورت ہوتی تو اس بات کو محسوس کرتی۔ وہ خواہ کیسا بھی سہی، یہ اطمینان تو بہر حال تھا کہ وہ تمہارا ہے۔ اب شراکت کی بات آ گئی ہے تو تم حوصلہ چھوڑ بیٹھی ہو۔ میری مانو تو اس کے برعکس سوچو کہ وہ تمہارے لیے کرتا ہی کیا تھا بلکہ ایک طرح سے بوجھ ہی تھا۔ اس انداز سے سوچو گی تو بہل جاؤ گی۔ اور پھر تمہیں اس سے زیادہ بچوں کو اہمیت دینی چاہیے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔"

"شاید نہیں یقیناً......!" وہ مسکرائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں اب چلوں گی...... اور سنو، اپنا خیال رکھنا۔ میری ہدایت پر عمل نہیں کیا تو میں سنجیدگی سے ناراض ہو جاؤں گی۔"

"میں تمہیں ناراض نہیں ہونے دوں گی۔" مہرو اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"اچھی بات ہے۔ میں کل پھر آؤں گی۔"

اس نے بچوں کو پیار کیا اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی کتنی دیر تک مہرو اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

پھر اگلے کئی دن صالحہ باقاعدگی سے اس کے پاس آتی رہی۔ علاج اور آرام نے جہاں اس

کی صحت پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ وہاں صالحہ کی باتوں نے بھی سہارا دیا۔ وہ کافی حد تک پرسکون بھی ہو گئی تھی بلکہ صالحہ کے سمجھانے کا اثر یہ ہوا کہ وہ اب نواز کے نہ آنے کو بہتر سمجھتی تھی۔ اور محسوس کر رہی تھی کہ پہلے وہ جو اس خوف میں مبتلا رہتی تھی کہ نواز آئے گا اور جو کچھ اس کے پاس ہے سب چھین کر لے جائے گا۔ اب وہ خوف نہیں رہا تھا اور خوف سے نکل کر ہی اس نے کچھ نئی امیدوں کا دامن تھاما تھا۔

اُمیدیں روشن رہیں تو جیسے سہارا مل جاتا ہے۔ لیکن اس نے ابھی امیدوں کے سہارے چلنا شروع کیا ہی تھا کہ ایک دن وہ آ گیا۔ اپنی پرانی حالت میں دروازے ہی سے اونچی آواز میں گالیاں دیتا ہوا۔

○○○

زندگی کا ایک رخ یہ بھی تھا۔ جہاں ہر موسم خوشیوں کا پیغام لے کر آتا تھا۔ نہ کسی چیز کا حصول ناممکن اور نہ کوئی پریشانی حال مطمئن تھا اور مستقبل روشن صالحہ بیگم صالحہ کو امیدوں کے چراغ جلانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی بلکہ جلتے ہوئے چراغ خود اس کی جھولی میں آن گرتے تھے۔ پھر وہ مطمئن کیوں نہ ہوتی۔ ہر طرف سے ہی مطمئن تھی۔

شوہر ایسا جس نے اسے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تھا۔ اور کبھی اس کی کسی بات سے اختلاف بھی نہیں کرتا تھا۔

بچے خوبصورت ہونے کے ساتھ ذہین بھی تھے اور اسے یقین تھا کہ بڑے ہونے پر وہ سب اپنے شعبوں میں کامیابی کے ساتھ ایک خاص مقام بنائیں گے۔

اور ایسا گھر جس کا کہ ہر عورت صرف تصور کر سکتی ہے۔ وہ اکثر سوچتی۔ اس نے اگر کچھ کھویا ہے تو اس سے کہیں بڑھ کر پایا بھی ہے۔ اور یہ پانے کا خیال زیادہ زور آور تھا جس نے اس کے دل سے اس کسک کو تقریباً مٹا ڈالا تھا۔ جو شادی کے ابتدائی چند سالوں میں...... اس کے دل میں رہی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اسے کسی کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔ بلکہ اکثر ماتا جی، اور پتا جی اور راجیش بھیا اسے یاد آتے اور ایسے وقت وہ ہمیشہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر بہلایا کرتی کہ شادی کے بعد تو لڑکی کو بابل کا آنگن چھوڑنا ہی ہوتا ہے۔ میں بھی چھوڑ آئی بہرحال اس نے کسی کی یاد کو جی کا روگ نہیں بنایا تھا۔ اس لیے مطمئن ہی تھی۔ لیکن اس کی مطمئن اور پرسکون زندگی میں اس دن ارتعاش پیدا ہوا جس دن اسے رام کاکا، کا خط ملا انہوں نے لکھا تھا۔

"پوجا بہن......! تمہاری ماتا جی بہت بیمار ہیں۔ گو کہ وہ ظاہر نہیں کرتیں۔ لیکن میں جانتا

ہوں کہ انہیں اندر ہی اندر تمہارا دکھ چاٹے جا رہا ہے۔ اگر ہو سکے تو آ کر انہیں اپنے شانت ہونے کا وشواس دلا جاؤ کیونکہ انہیں وشواس نہیں ہے کہ تم شانت ہوگی۔"

میں کیسے آپ کو یقین دلاؤں ماتا جی کہ میں بہت سکون سے ہوں۔ اس نے خط سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ڈالا اور سوچنے لگی۔ ماتا جی کی بیماری کا پڑھ کر وہ پریشان ہوگئی تھی اور ڈسٹرب بھی اس لیے کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور نہ ہی کسی سوچ کو وہ اپنی گرفت میں لے سکی۔ بس اتنا ہوا کہ اس کا ذہن بھٹکتے بھٹکتے کہیں پیچھے سفر کر گیا تھا۔ اور ذہن بھٹکانے میں اس نام کو بڑا دخل تھا جس سے برسوں بعد کسی نے مخاطب کیا تھا۔ اور جسے وہ برسوں پہلے اپنی گزشتہ زندگی اور یادوں کے ساتھ ہی دفن بھی کر چکی تھی۔

"پوجا......! پوجا......!" ہر طرف سے اسے...... ماتا جی پکارتی ہوئی نظر آئیں۔ کبھی اس کے بالوں میں کنگھی کرتی ہوئی۔ کہیں دودھ کا گلاس لیے اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی اور کہیں ماتھے پر بندیا سجاتی۔ وہ عہد گزشتہ میں گم ہونے جا رہی تھی جہاں ہر طرف پوجا پوجا کی صدائیں تھیں کہ خضر کی آواز نے اسے فوراً ہی حال میں لا کھینچا۔

"صالحہ......!" وہ پکارتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اور وہ بے حد خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے......؟" وہ اس کے اس طرح دیکھنے پر پوچھنے لگا۔

"کچھ نہیں......" پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔ "تم آج جلدی کیسے آ گئے۔"

"کہو تو واپس چلا جاؤں۔"

"ارے نہیں......! میں تو یونہی پوچھ رہی تھی۔" وہ اس کے ہاتھ سے کوٹ کو لے کر ہینگر پر لٹکانے لگی تو وہ ایزی چیئر پر بیٹھ کر شوز اتارنے لگا۔

"چائے لاؤں......؟"

"نہیں......! تم یہاں میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔" وہ کچھ سوچتی ہوئی اس کے سامنے آ بیٹھی تو وہ کہنے لگا۔

"میں پچھلے کئی دنوں سے تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں۔ کیا کوئی ایسی ہی وجہ ہے جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔"

"پچھلے کئی دنوں سے۔" اس نے قدرے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں......! اور تم نے تو بتایا نہیں۔ لیکن ڈاکٹر رضی نے بتایا ہے کہ تم اس کے کلینک بھی گئی

تھیں۔"

"ہاں......!" اسے یاد آیا تو کہنے لگی۔ "اصل میں مہرو کی وجہ سے پریشان ہو رہی ہوں۔"

"کون مہرو......؟" فوری طور پر اس کے ذہن میں نہیں آیا تو پوچھنے لگا۔

"مہر النساء، حق نواز کی بیوی...... کیا بھول گئے......؟"

"نہیں بھولا تو نہیں۔ بس ادھر خیال نہیں گیا تھا ہاں کیا ہوا اسے۔"

"بے چاری بہت بیمار تھی۔ اور زندگی سے مایوس بھی۔" پھر وہ اسے تفصیل بتانے لگی۔

"اب کیسی ہے......؟" جب وہ بتا چکی تو وہ پوچھنے لگا۔

"اب اللہ کا شکر ہے...... بہت بہتر ہے۔"

"پھر تم کیوں پریشان ہو......؟"

"کیا......؟" وہ ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں......! جب میں آیا تو تمہیں پریشان ہی دیکھا تھا۔" اب بتائے بنا چارہ نہیں تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"رام کاکا، کا خط آیا ہے میں اسے پڑھ کر پریشان ہو گئی تھی۔"

"کیا لکھا ہے......؟"

"ماتا جی بیمار ہیں۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔ پھر دراز میں سے خط نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ "لو خود ہی پڑھ لو۔"

وہ خط پڑھنے لگا تو وہ چائے لانے کے بہانے کمرے سے نکل گئی۔ گو کہ اس کے جذبات و احساسات بالکل فطری تھے پھر بھی جانے کیوں وہ اس سے چھپانا چاہ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ چائے لے کر آئی تو وہ لباس تبدیل کر چکا تھا۔ وہ چائے کا کپ اسے تھما کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ وہ بھی کچھ دیر تک خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بظاہر لاتعلق سی بیٹھی تھی۔ لیکن اس کا ہر انداز بتا رہا تھا جیسے وہ اس کے بولنے کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ زیر لب مسکرایا پھر کہنے لگا۔

"صالحہ......! میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ اگر تم کبھی جانا چاہو گی تو میں تمہیں روکوں گا نہیں۔" وہ شاکی نظروں سے دیکھنے لگی۔ تو وہ فوراً وضاحت کرنے لگا۔

"میرا مطلب ہے گھر والوں سے ملنے کے لئے۔"

"کیا مجھے جانا چاہئے......؟"

"کیوں نہیں...... وہ تمہارے ماں باپ ہیں۔ اور میرا خیال ہے ان کی خفگی میں اب وہ

شدت بھی نہیں رہی ہو گی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں دیکھ کر جو تھوڑی بہت خفگی رہ گئی ہو گی وہ بھی دور ہو جائے گی۔"

"لیکن پتا نہیں کیوں مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کس بات سے......؟"

"پتا نہیں......" کچھ دیر رک کر کہنے لگی۔ "کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟"

"میرا خیال ہے۔ فی الحال میرا جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

"پھر......؟"

"کسی بچے کو لے جاؤ۔" وہ چپ ہو کر جانے کیا سوچنے لگی۔

"پھر میں تمہارے ویزے کی کوشش کروں......؟"

"ہاں......! اور میرے ساتھ حسام جائے گا۔"

"جسے بھی لے جاؤ۔" خضر کو اس کی خوشی مطلوب تھی۔

پھر اگلے کئی دن تک وہ جانے کی تیاریوں میں لگی رہی۔ تقریباً بارہ سال کے بعد وہ جا رہی تھی۔ خوش بھی تھی اور انجانے اندیشوں نے بھی دامن تھام رکھا تھا۔ بہرحال اندیشوں پر سب سے ملنے کی خوشی زیادہ حاوی تھی۔ اس لیے وہ چلی گئی صرف حسام کو لے کر۔

○ ○ ○

حق نواز پھر ہر دوسرے دن آنے لگا تھا۔ اس دوسری عورت نے شاید اپنے آپ کو زمانے کی نظروں سے بچانے کی خاطر اس سے شادی کی تھی۔ ورنہ اسے نواز سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جبھی وہ بے غیرتوں کی طرح اس کے سامنے چلا آتا۔ مانگنے سے نہ ملتا تو زبردستی پر اتر آتا تھا۔ مارتا پیٹتا اور آخر میں وہی بچوں کو چھین لے جانے کی دھمکی دیتا اور وہ ہار جاتی۔

بس احساس نہ مرے۔ احساس مر جائے تو انسان، انسان نہیں رہتا جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ وہ بھی جانوروں سے بدتر نظر آتا تھا۔

اس روز وہ آیا اور یہ حقیقت تھی کہ اس وقت مہرو کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اسے یقین دلاتی رہی کہ میرے پاس تمہیں دینے کے لئے تو کیا اپنے گھر کے لئے بھی کچھ نہیں۔ لیکن اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے اپنے سارے حربے آزما ڈالے اور وہ کچھ ہوتا تو اس کے حوالے کرتی۔ مار بھی کھائی اور جلے دل کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا۔

"لے جاؤ جسے لے جانا چاہتے ہو۔"

وہ شاید حیران ہوا کیوں کہ جہاں بچوں کی بات آتی تھی وہ ہتھیار ڈال دیتی تھی۔ لیکن آج اس نے ہتھیار نہیں ڈالے ہتھیار ڈال دیتی تو اس کا مطالبہ کہاں سے پورا کرتی۔

’’میں انہیں لے جا کر کیا کروں گا۔‘‘ وہ چیخا۔

’’جو دل چاہے کرو۔‘‘ اس نے دل پر پتھر رکھ کر رخ موڑ لیا۔

’’مار ڈالوں گا اسے۔‘‘ وہ طیش میں آگیا اور فراز کو کھینچ کر اس کے گلے پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ’’امی......! امی......!‘‘ فراز چیخا تو وہ فوراً پلٹ کر دیکھنے لگی۔ اور اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ وہ نشے میں تھا اور اس سے کوئی بعید نہیں تھا کہ اسے مار ہی ڈالتا۔

’’یہ کیا کر رہے ہو......چھوڑو اسے۔‘‘

وہ اس پر جھپٹی لیکن اس نے اتنی زور سے اس کے پیٹ پر لات ماری کہ وہ تیورا کر وہیں گر پڑی۔ اس صورت حال سے رابعہ اونچی آواز میں رونے لگی اور فراز اپنا آپ چھڑانے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا۔

’’کتے کے بچے......!‘‘

نواز نے کس کے چانٹا فراز کے منہ پر دے مارا۔ اس غیر متوقع تھپڑ سے فراز کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا لیکن پھر وہ فوراً ہی سنبھلا اور اس کے ہاتھ پر اپنے دانت گاڑ دیے۔ جس سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑنے کی دیر تھی کہ فراز نے اپنے آپ کو چھڑایا اور بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ اور وہ جو ادھ کھلی آنکھوں سے یہ خوفناک منظر دیکھ رہی تھی فراز کو باہر جاتے دیکھ کر آنکھیں بند کر گئی۔

’’چھوڑوں گا نہیں۔ ایک ایک کو قتل کر ڈالوں گا۔‘‘ وہ دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا۔ تو رابعہ آ کر اس سے لپٹ گئی۔

’’امی......! امی......!‘‘ رابعہ رو رو کر پکارے گئی۔ لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

جس وقت اسے ہوش آیا۔ ہر طرف رات کی سیاہی پھیل چکی تھی اور وہ ننگی زمین پر سیدھی لیٹی تھی۔ رابعہ اس کے سر کے پاس بیٹھی چپ چاپ آنسو بہائے جا رہی تھی۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر فوراً اس پر جھک گئی۔

’’امی......! آپ کو کیا ہو گیا ہے......؟‘‘ اس نے خالی خالی نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ پھر اس کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

’’تم مت روؤ بیٹی......!‘‘ اسے چپ کراتے ہوئے وہ خود رو پڑی۔

’’امی......! آپ سو رہی تھیں اور مجھے اکیلے میں ڈر لگ رہا تھا۔‘‘ رابعہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔ تو اسے فراز کا خیال آیا۔ فوراً پوچھنے لگی۔

’’فراز کہاں ہے......؟‘‘

’’فراز اس وقت نکلا تھا۔ ابھی تک نہیں آیا۔‘‘

’’کیا......؟‘‘ اس کے منہ سے چیخ نما آواز نکلی اور جیسے ہی اٹھنے کی کوشش کی پیٹ میں بڑی زور سے درد اٹھا اور وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ لیکن پھر فوراً ہی دوبارہ کوشش کرنے لگی۔

’’بیٹی......! فراز کو تمہارے ابا تو نہیں لے گئے......؟‘‘ ایک ہاتھ سے پیٹ کو دبائے وہ کسی خیال کے تحت پوچھنے لگی۔

’’نہیں امی......! فراز تو پہلے ہی نکل گیا تھا۔‘‘

’’پھر کہاں رہ گیا اور ابھی تک آیا کیوں نہیں۔‘‘ وہ جیسے اپنے آپ سے بولی اور قیاس کرنے لگی کہ وہ کہاں ہو سکتا ہے۔

’’امی......! میں دیکھوں فراز کو۔‘‘ رابعہ نے کہا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

’’کہاں دیکھو گی......؟‘‘

’’باہر نکل کر......‘‘

’’جاؤ پہلے عرفان چاچا کے گھر دیکھو۔ وہاں نہ ہو تو عرفان چاچا سے کہنا وہ فراز کا پتا کریں۔‘‘

اس نے جیسے ہی بات ختم کی رابعہ اٹھ کر چل دی۔ وہ بھی بھائی کی طرف سے خاصی پریشان تھی۔ اور جس زور سے ابا نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ اس کا دل دکھ کر رہ گیا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ بھائی کو اپنی آغوش میں سمیٹ لے۔ گو کہ اس کے برابر ہی تھی۔ لیکن زندگی میں بعض مقام ایسے بھی آجاتے ہیں جب بہنیں چھوٹی ہونے کے باوجود ماں کا کردار ادا کرنے لگتی ہیں اور کبھی بھائی باپ بن جاتے ہیں۔

رابعہ کے جانے کے بعد مہرو کچھ دیر وہیں لیٹی رہی۔ پھر بمشکل تمام اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی چارپائی تک آئی۔ اس ذرا سی مشقت سے اس کے پیٹ کی تکلیف بڑھ گئی اور سانس لینا دشوار ہو گیا تھا۔ پھر رابعہ کو اکیلے واپس آتے دیکھ کر وہ اندیشوں میں گھر گئی۔ باوجود کوشش کے کوئی سوال نہ کر سکی۔ رابعہ خود ہی بتانے لگی۔

’’فراز عرفان چاچا کے گھر نہیں ہے۔ میں نے ان سے کہا ہے اسے ڈھونڈ لائیں۔ اور وہ اسے ڈھونڈنے گئے ہیں۔‘‘

’’اللہ کرے جلدی آجائے۔‘‘ اس نے کہا۔ پھر اس کی زبان پر دعائیں جاری ہو گئیں۔ وہ جتنا اس کے لیے دعائیں کر رہی

تھی اس کا دل بیٹھتا جا رہا تھا۔ شاید ہر دعا کے ساتھ کوئی منفی سوچ بھی اس کے دماغ میں آ جاتی تھی۔ کتنی دیر گزر گئی۔ ایک گھنٹہ، دو گھنٹے، وہ ہر آہٹ پر چونکتی اور آخر میں اس کی نظریں دروازے پر جم کر رہ گئیں۔ کہ کسی پل وہ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوگا۔

"رابعہ......!" دستک کے ساتھ عرفان نے باہر ہی پکارا تو اس نے فوراً رابعہ کو جانے کے لیے کہا۔ رابعہ گئی اور پھر واپس آ کر کہنے لگی۔

"عرفان چاچا آپ کو بلا رہے ہیں۔"

"بیٹا......! میں چل نہیں سکتی تم انہیں اندر لے آؤ۔ لیکن ٹھہرو پہلے مجھے ایک چادر لا کر اوڑھا دو۔" رابعہ نے کمرے سے ایک چادر لا کر اسے اڑھائی۔ پھر عرفان کو بلا لائی۔

"کیا ہوا بھابی......! کہاں چلا گیا ہے فراز......؟" اور اسے شام کا سارا واقعہ دہرانا پڑا۔

"میرا خیال ہے، نواز باہر ہی سے اسے اپنے ساتھ لے گیا ہوگا۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں صبح تک آ جائے گا۔" عرفان نے اسے تسلی دی۔ وہ نواز کا نام سنتے ہی خوفزدہ ہو گئی۔

"تم نہیں جانتے عرفان بھائی! وہ ایک دم وحشی بن چکا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ بے فکر رہیں۔ صبح میں خود جا کر فراز کو لے آؤں گا۔"

پھر وہ تو اپنے طور پر اس کی ڈھارس بندھا کر چلا گیا لیکن وہ سولی پر لٹک گئی تھی۔ ایک پل کو چین نہیں ملا۔ تمام رات دروازے کو تکتے ہوئے گزاری۔

صبح منہ اندھیرے اس نے رابعہ کو اٹھا کر عرفان کے پاس بھیج دیا تھا۔ پھر عرفان نواز کی طرف جانے سے پہلے اس کے پاس ہوتا ہوا گیا تھا اور اس نے بہت زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ واپس آ کر بتایا۔ فراز وہاں نہیں ہے اور نہ ہی نواز اسے لے کر گیا تھا۔ وہ کتنی دیر تک سکتے کی حالت میں بیٹھی عرفان کو دیکھتی رہی۔ رونا چاہا لیکن آنسو آنکھوں میں اتر کے نہ دیے۔ چیخنا چاہا تو آواز ساتھ چھوڑ گئی۔

"بھابی......!" عرفان اس کی حالت سے پریشان ہو کر پکارنے لگا۔

"امی......!" رابعہ جھنجھوڑنے لگی۔ اور پھر وہ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ چارپائی کی پٹی کے ساتھ سر ٹکرانے لگی۔

"کہاں چلا گیا میرا فراز...... کہاں چلا گیا" وہ چیخ کر پوچھنے لگی۔ عرفان نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔ رابعہ سے پانی منگوا کر پلایا۔ کسی حد تک پرسکون ہوئی تو یقین دلایا کہ وہ فراز کو ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

پھر عرفان چلا گیا تو وہ اپنی ساری تکلیف بھول کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں خود ڈھونڈوں گی اپنے فراز کو۔" برقعہ اوڑھا اور رابعہ کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ وہ کبھی گھر سے نہیں نکلی تھی۔ نہ ضرورت سے اور نہ بلا ضرورت۔ شہر کا ہر راستہ اس کے لیے انجان تھا۔ پھر بھی وہ مامتا کی ماری عورت ایک ایک گلی کوچہ چھانتی پھری۔ ہر ایک کو روک کر پوچھا۔

"تم نے میرے فراز کو تو نہیں دیکھا......؟"

"دیکھو......! کہیں نظر آئے تو اسے گھر پہنچانا۔"

سارا سارا دن وہ شہر کی خاک چھانتی۔ ہر دوسرے بچے پر فراز کا گمان کر کے اس کی طرف لپکی تھی۔ پھر مایوس ہو کر شام ڈھلے گھر کی راہ لیتی تھی۔ اس دوران ایک بار نواز آیا تو اس کا ہاتھ اس کے گریبان تک چلا گیا۔

"تم نے مارا ہے میرے فراز کو۔ تم قاتل ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

وہ جیسے پاگل ہو گئی تھی۔ دھکے دے کر نواز کو نکال دیا۔

اسی رات مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے سے پہلے اسے صالحہ کا خیال آیا تو امید کی ہلکی سی کرن دل میں روشن ہوئی۔

"وہ یقیناً میری مدد کرے گی۔" وہ سوچنے لگی۔ "ہمیشہ وہی میرے کام آئی ہے۔ ادھر اتنے دنوں سے پتا نہیں کیوں نہیں آئی۔ خیر میں خود ہی کل اس کے پاس جاؤں گی۔ اور کہوں گی میری مدد کرے۔ میرے فراز کو کہیں سے ڈھونڈ کر لا دے۔ وہ بڑی آدمی ہے۔ اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔"

امید کی کرن نظر آئی تو تھوڑا حوصلہ بھی ہوا اور کچھ دیر کو سو بھی گئی ورنہ نیندیں تو فراز کے ساتھ ہی کہیں کھو گئی تھیں۔

صبح سویرے ہی وہ رابعہ کو لے کر نکل پڑی۔ ان چند دنوں میں وہ پورے شہر میں اتنی بار چکرائی تھی کہ راستوں سے کافی حد تک آشنائی ہو گئی تھی۔ صالحہ کا دیا ہوا کارڈ اس کی مٹھی میں دبا تھا۔ شہر کے صاف ستھرے علاقے میں پرشکوہ عمارتوں کو دیکھتی ہوئی وہ بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔ پھر ایک بڑے سے بنگلے کی پیشانی پر الخضر لکھا دیکھ کر وہ رک گئی۔ کارڈ پر بھی یہی نام لکھا تھا۔ نمبر ملایا، نمبر بھی وہی تھا۔ قدرے سکون کا سانس لیا اور رابعہ کی کلائی پر گرفت مضبوط کرتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا خیال تھا وہ بلا جھجک اندر چلی جائے گی۔ لیکن چوکیدار نے اسے روک دیا۔

"اے مائی......! اندر کہاں جا رہی ہو......؟" چوکیدار نے اسے کوئی بھکارن سمجھا تھ
لیے سخت آواز میں بولا۔ وہ حلیے سے بھی تو ایسی ہی لگ رہی تھی۔ اپنا ہوش ہوتا تو یہاں آنے ک
لیے کوئی اہتمام بھی کرتی۔

"مجھے صالحہ سے ملنا ہے۔" اس نے بے تکلفی سے نام لیا تو چوکیدار نرم پڑتا ہوا بولا۔

"بیگم صاب نہیں ہیں۔"

"وہ انڈیا گئی ہوئی ہیں۔"

"انڈیا......!" امید کی آخری کرن بھی بجھنے لگی۔ "خضر صاحب ہیں۔"

"وہ بھی نہیں ہیں۔ کل شام کراچی گئے ہیں۔ دو دن کے بعد آنا۔ صاحب آ جائیں گے۔"

"دو دن......" مری مری آواز سے دہرایا اور قدموں کو واپس کے لیے موڑ لیا۔ اب وہا
رکنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ واپسی کے سارے راستے بے نشان ہوئے جا رہے تھے۔ آنکھو
میں ایسی دھند آ سمائی تھی کہ دو قدم کے فاصلے پر بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بمشکل تمام گھر تک پہنچی او
دہلیز پار کرتے ہی سارے حوصلے ٹوٹ گئے۔

"اب کہاں تجھے ڈھونڈوں۔ جانے کس کے ہتھے چڑھ گیا۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رابعہ اسے چپ کراتے کراتے بالآخر خود بھی رونے لگی تھی۔

"امی......! آپ نہ روئیں۔ فراز آ جائے گا۔"

رابعہ نے پھر آس بندھانی چاہی۔ لیکن وہ مکمل طور پر مایوسیوں کے اندھیاروں میں ڈوب چکی تھی۔ شام تک وہ تیز بخار میں جلنے لگی اور سینے کی تکلیف پھر شروع ہو گئی۔ اس کے باوجود وہ آنگن میں بچھی چارپائی پر لیٹی دروازے پر نظریں جمائے رہی۔ موسم کچھ ابر آلود تھا اور فضاؤں میں خنکی سمائی تھی۔ جسے وہ محسوس بھی کر رہی تھی۔ پھر بھی وہاں سے نہیں اٹھی۔ رابعہ کو اس نے اندر سلا دیا تھا۔ اور خود فراز کی راہ دیکھ رہی تھی۔ شاید اوپر والے کو رحم آ جائے۔ لیکن اوپر والے کو رحم تو تب آتا جب اس نے اس کے نصیب میں کوئی سکھ لکھا ہوتا۔

"میرے اللہ......!" اس کی نظریں دور آسمانوں پر بھٹکنے لگیں۔ "میری طاقت سے زیادہ مجھے نہ آزما۔ مجھ سے یہ دکھ برداشت نہیں ہو رہا۔ پتا نہیں میرا بچہ کہاں مارا مارا پھر رہا ہوگا۔ تو میرے اللہ اسے اپنی امان میں رکھنا اور کسی طرح اسے گھر کا راستہ دکھا دے۔"

اس کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی اور وہ یونہی روتے روتے سو گئی

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ جب بارش ہونے لگی۔ اس کی آنکھ فوراً ہی کھل گئی۔ لیکن وہ اٹھ کر اندر نہیں گئی۔ اصل میں آنکھ کھلتے ہی اسے فراز کا خیال آیا تھا اور ساتھ میں یہ خیال بھی کہ وہ

بارش میں نہ بھیگ رہا ہو۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ تو بارش میں بھیگتا ہو اور وہ چھت تلے چلی جائے۔

بقیہ تمام رات بارش وقفے وقفے سے ہوتی رہی تھی۔ اور صبح جب ہوئی تو وہ ننگی چارپائی پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کی کھلی آنکھیں اب بھی دروازے پر لگی تھیں۔

ایک بار یہیں بیٹھ کر اماں نے دعا کی تھی کہ مجھے آزمائشوں سے نکال اور اوپر والے نے آزمائشوں کے ساتھ دنیاوی جھمیلوں سے بھی نکال لیا تھا۔ اور رات وہ دعا کر رہی تھی۔ "میری طاقت سے زیادہ مجھے نہ آزما۔" اس نے مزید نہیں آزمایا اور فراز کو گھر کا راستہ دکھانے کی بجائے اسے اپنی طرف کا راستہ دکھا دیا تھا۔

رابعہ کو اٹھانے والی آواز خاموش تھی۔ اس لیے وہ بھی دن چڑھے تک سوتی رہی۔ اپنی مرضی سے اٹھی۔ کمرے میں امی کو نہ پا کر باہر آئی اور اسے چارپائی پر لیٹے دیکھا۔ بارش کے بعد چمکیلی دھوپ اس کے وجود کو چھو رہی تھی۔

"امی......!" پکارتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ بار بار پکارا کندھا بھی ہلایا۔ لیکن وہ نہیں اٹھی۔ رابعہ حیران ہوئی اور جا کر عرفان چاچا کو بلا لائی۔ عرفان چاچا کیا آئے کہ اس کا گھر عورتوں سے بھرنے لگا تھا۔

"کیا ہوا ہے امی کو......؟" اس نے کسی عورت کا دامن تھام کر پوچھا۔

"تمہاری امی اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں۔"

"اللہ میاں کے پاس...... مجھے چھوڑ کر۔" اس کی آواز میں دکھ سمٹ آیا۔ اور دل کی نرم نرم زمین پر اس خیال نے بیج بو دیا۔

"میں اکیلی ہو گئی ہوں۔"

خواتین کلام پاک پڑھنے میں مصروف ہو گئیں اور کچھ باتوں میں۔ وہ چپ چاپ ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئی۔

وقت کے ظالم پنجے نے پہلے بھائی چھینا۔ اب ماں چھین لی۔ اس کا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔ لیکن کوئی مہربان آغوش نظر نہیں آ رہی تھی جس میں منہ چھپا کر رو سکے۔ آنسوؤں کو اندر ہی پیتی خالی خالی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھے گئی۔ یونہی بھٹکتی ہوئی اس کی نظریں دروازے کی طرف اٹھیں تو وہ زرد پڑ گئی۔ عرفان چاچا کے ساتھ ابا آ رہے تھے۔ اس نے خوفزدہ ہو کر گھٹنوں میں منہ چھپا لیا تھا۔

پھر سب اس کی امی کو لے کر چلے گئے تھے اور گھر بھی آہستہ آہستہ خالی ہو گیا۔ صرف ایک

خاتون رہ گئی تھی جو ابا کے آنے تک موجود رہی۔ اور ابا آئے تو اسے بلا کر کہنے لگے۔

"یہ تمہاری اماں ہیں۔ اب یہیں تمہارے پاس رہیں گی۔"

"اماں......!" اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ اور وہ خالی خالی نظروں سے اس عورت کو دیکھنے لگی۔ جس کے چہرے پر تختی تھی اور انداز میں بیزاری۔ اس کا دل چاہا چیخ چیخ کر کہے۔ یہ میری اماں نہیں ہیں۔ لیکن دل کی نرم زمین میں دبے "میں اکیلی ہوں" کے بیج نے اسے بولنے سے باز رکھا اور زندگی کے اس مقام پر ہی وہ جان گئی کہ اس کی بولنے کی آزادی اور احتجاج کا حق سب کچھ امی اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔

وہ کچھ بولے گی تو خطاوار ٹھہرے گی۔

احتجاج کرے گی تو سزاوار ٹھہرے گی۔

کوئی مہربان ہاتھ بھی نہیں جو سزا سے بچا سکے۔

سوئم کے بعد وہ لڑکا بھی اسی گھر میں آ کر رہنے لگا جس کی یتیمی کا خیال کر کے ابا نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا تھا۔ نادر جس کے بارے میں ابا نے امی کو بتاتے ہوئے کہا تھا۔ تمہارے بچوں سے کچھ بڑا ہے۔ وہ اس سے دو سال ہی بڑا ہوگا۔ لیکن اس کے انداز سترہ اٹھارہ سالہ لڑکوں کے سے تھے۔ یہ تمہارا بھائی ہے فراز کی طرح۔ لیکن اسے اس میں فراز جیسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ بلکہ اس سے تو عجیب طرح کا خوف محسوس ہوتا تھا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ شروع کے دو چار دن ہی اماں کا رویہ اس سے ٹھیک رہا تھا۔ پھر فوراً ہی وہ روایتی سوتیلی ماں کے روپ میں آ گئیں۔ اور سہنا تو جیسے اس گھر کی مٹی میں لکھا تھا۔ پہلے اماں پھر امی اور اب وہ یعنی رابعہ حق نواز۔ اتنی سی عمر میں ہر بات سہنے کا حوصلہ پیدا کر رہی تھی۔

وہ پانچویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ اماں نے آتے ہی سب سے پہلے اسے اسکول سے اٹھا دیا۔ یہ کہہ کر کہ کون سا تمہارا باپ کما کر لاتا ہے۔ اسے اسکول چھوڑنے کا بہت دکھ ہوا اور فوری طور پر اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اب وہ بڑی آدمی نہیں بن سکے گی۔

پھر آہستہ آہستہ گھر کی ساری ذمہ داریاں اس کے ناتواں کندھوں پر ڈال کر اماں بالکل فارغ ہو گئیں۔ اس نے اپنی امی کو حالات کی چکی میں چپ چاپ پستے دیکھا تھا۔ اور وہ بھی ان کی بیٹی تھی۔ کوئی حرف شکایت زبان پر لائے بغیر اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

اماں جو کہتیں وہ چپ چاپ سن لیتی۔ جو حکم دیتیں فوراً بجالاتی۔ سارا دن وہ اسے پھرکی کی طرح نچاتی تھیں۔ رات میں جب وہ سونے کے لئے اسٹور میں بند ہوتی تو فرش پر بچھے پرانے

گدے پر گرتے ہی اسے بے تحاشا تھکن کا احساس ہوتا۔ دل چاہتا بے خبر ہو کر سو جائے۔ لیکن وہ اپنی خواہش کو دباتے ہوئے اپنا بستہ لے کر بیٹھ جاتی۔ وہ کتابیں جنہیں وہ کتنی بار پڑھ چکی تھی دوبارہ پڑھتی۔ اس کے بعد وہ امی کو یاد کرتی اور یہ بات دہراتے ہوئے سو جاتی "میں بڑی آدمی بنوں گی۔"

○○○

صالحہ تین مہینے کے بعد انڈیا سے واپس آئی۔ خاصی خوش تھی اور یہ خوشی ہی کی بات تھی کہ اس کے ماتا جی اور پتا جی اب اس سے خفا نہیں رہے تھے۔ وہ انہیں یقین دلانے میں کامیاب ہو گئی تھی کہ اپنی اس زندگی میں بہت خوش اور پرسکون ہے۔

تین مہینے وہ اپنے گھر اور بچوں سے دور رہی تھی۔ اب آئی تو اس کا زیادہ وقت بچوں میں گزرنے لگا۔ ان کی تعلیم اور دیگر سرگرمیوں کا اس نے از سر نو جائزہ لیا۔ پھر ہر بات معمول کے مطابق دیکھ کر ہی اسے اطمینان ہوا تھا۔ وہ بچوں سے دور ضرور رہی تھی لیکن غافل نہیں تھی۔ گو کہ بچوں کے پاس بوا موجود تھی پھر بھی اس کا سارا دھیان ادھر ہی رہا تھا۔ گھر سے مطمئن ہوئی تو خضر کا تنقیدی جائزہ لینے لگی۔

"خاصے کمزور ہو گئے ہو۔ میرا خیال ہے تم نے اپنی طرف سے لاپروائی برتی ہے۔" وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں نہیں بلکہ تم میری طرف سے لاپرواہ ہو گئی ہو۔" وہ شکوہ کرنے لگا۔

"میں......؟ نہیں تو......"

"کیوں......؟ جب سے آئی ہو بچوں میں لگی ہوئی ہو۔ میں تو جیسے پس منظر میں چلا گیا ہوں۔"

"نہیں خضر......! اصل میں، میں بچوں کو چیک کر رہی تھی کہ کہیں میری غیر موجودگی میں وہ بگڑ تو نہیں گئے۔"

"میرا خیال نہیں آیا تمہیں......؟ میں بھی تو بگڑ سکتا تھا۔" اس کے یہ کہنے پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ پھر بڑے یقین سے بولی۔

"تم نہیں بگڑ سکتے۔"

"کیوں......؟"

"میری محبتوں میں بڑی طاقت ہے خضر جو تمہیں کبھی بگڑنے نہیں دیں گی۔"

"اتنا زعم......!" وہ مسکرایا۔

"آزما دیکھو......!"

"آزمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بہت پہلے تمہاری محبتوں پر ایمان لا چکا ہوں۔"

"اچھا......!" وہ خوشدلی سے ہنسی۔

کچھ دن اور گزرے۔ جب ہر بات پہلے والے معمول پر آگئی تب وہ فراغت سے بیٹھی اور ایسے ہی فراغت کے لمحوں میں اسے مہر النساء کا خیال آیا۔ تو وہ اسی وقت اس کی طرف چل پڑی۔ اس کے گھر میں داخل ہوئی تو استقبال ایک دوسری عورت نے کیا۔ جسے وہ بالکل نہیں جانتی تھی۔

"مہر النساء کہاں ہیں......؟" وہ ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"آپ بیٹھیں تو......" زرینہ بیگم اس کی قیمتی کپڑوں اور امیرانہ انداز سے مرعوب تھیں۔ وہ بیٹھ گئی اور پھر اپنا سوال دہرایا۔

"مہر النساء تو مرگئی۔"

"کیا......؟" اس کی آواز کنٹرول سے باہر ہوگئی اور وہ غیر یقینی سے زرینہ بیگم کو دیکھنے لگی۔

"ہاں......! اسے مرے ہوئے تو دو مہینے ہو گئے ہیں اور آپ کون ہیں......؟"

"میں اس کی کچھ بھی نہیں اور بہت کچھ ہوں۔" ضبط کرتے کرتے بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے جنہیں اس نے رومال میں جذب کرلیا۔

"کیا مطلب......؟" زرینہ بیگم پوچھنے لگیں۔

"میں اس کی بہن ہوں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔ پھر پوچھنے لگی۔ "اس کے بچے کہاں ہیں......؟ فراز اور رابعہ۔"

"فراز تو جی اس کی زندگی ہی میں گھر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور اسے فراز ہی کا غم لے ڈوبا۔ جب کہ رابعہ یہیں موجود ہے۔"

"فراز گھر چھوڑ گیا...... کیوں......؟" وہ حیرت سے بولی۔

"پتا نہیں...... میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" زرینہ بیگم نے مکاری سے کام لیا۔

"لیکن وہ تو بہت نیک بچہ تھا۔ کہیں نواز نے تو......"

"نواز کا نام کیوں لے رہی ہیں......؟ زرینہ بیگم فوراً بات کاٹ گئیں۔" وہ اس کا باپ ہے کوئی دشمن تو نہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم......! اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ تم کون ہو۔"

"میں نواز کی بیوی ہوں۔" زرینہ نے ایک ادا سے کہا۔ تو وہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔

"رابعہ کو بلاؤ۔ میں اس بچی سے مل لوں۔" اس نے کہا تو زرینہ وہیں بیٹھے بیٹھے آواز دے ڈالی۔

"رابعہ......!" صالحہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

میلے کپڑے، چپلوں کی قید سے آزاد پیر جو مٹی دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ اس کے وہ خوبصورت بال جن کی مہرو صبح وشام حفاظت کیا کرتی تھی، گرد کی تہوں میں چھپ کر اپنی اصل رنگت کھو رہے تھے اور سہمی ہوئی آنکھیں جن میں ایک انجانا خوف ٹھہر گیا تھا۔ وہ زیادہ دیر اس کی طرف نہ دیکھ سکی کیونکہ آنکھوں میں نمی نے اتر کر دھند کی ہلکی سی چادر تان دی تھی۔

○○○

صالحہ بار بار پلکوں کو جھپکنے لگی۔ آنکھوں میں اتری ساری نمی اس نے اپنے اندر اتاری۔ شاید وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ دھند چھٹی تو رابعہ کا چہرہ نظر آیا۔ ساتھ ہی مہرو کی آواز کی بازگشت۔

"میرے بعد کوئی نہیں ہے۔ جوان بچوں کے سر پر ہاتھ رکھے۔ ایک تم ہی ہو جو"

"میں تمہاری تسلی کی خاطر وعدہ کرتی ہوں۔"

اسے اپنا وعدہ یاد آیا تو ہاتھ بڑھا کر رابعہ کو اپنے پاس کھینچ لیا۔ پھر اس کے میلے کپڑوں کا خیال کیے بغیر اپنی گود میں بٹھایا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے زرینہ سے کہنے لگی۔

"میں نے مہرو سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے بعد اس کے بچوں کو اپنے پاس رکھوں گی۔ حق نواز کو بلاؤ۔ میں اس کی اجازت سے رابعہ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

زرینہ بیگم نے ایک پل میں بہت ساری باتیں سوچ ڈالیں۔ رابعہ چلی گئی تو ایک مفت کی نوکرانی سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ اور پھر یہ بھی کسی طرح گوارا نہیں تھا کہ مہر النساء کی بیٹی کسی اچھے گھر میں پروان چڑھے۔ فوراً کہنے لگی۔

"نواز کسی طرح بھی اپنی بیٹی کو آپ کے ساتھ نہیں بھیجے گا۔"

"کیوں......؟"

"ظاہر ہے ایک ہی بیٹی ہے اس کی۔"

"ایک ہی ہے تو کون سا اس کا خیال رکھتا ہے۔ اپنا ہوش تو ہے نہیں اسے۔"

"آپ کچھ بھی کہیں جی۔ رابعہ آپ کے ساتھ نہیں جائے گی۔" اپنی طرف سے زرینہ بیگم نے فیصلہ دے دیا۔

''مجھے نواز سے بات تو کر لینے دو۔''

''اس سے کیا بات کریں گی۔ میں جو ہوں اور میں اسے نہیں بھیج سکتی۔ کیونکہ لوگ تو میرے ہی سر الزام رکھیں گے کہ سوتیلی ماں تھی۔ ایک بچی کو نہ رکھ سکی۔''

اس کی بات مناسب تھی اس لئے صالحہ اس سے کچھ کہنے کے بجائے رابعہ سے پوچھنے لگی۔

''میرے ساتھ چلو گی......؟'' رابعہ جواب دینے کے بجائے زرینہ کی طرف دیکھنے لگی۔ گو کہ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی لیکن اس کے چہرے کا تناؤ بتا رہا تھا کہ وہ رابعہ کے منہ سے نہ سننا چاہتی تھی۔ اور رابعہ ان دو مہینوں میں اس کا ہر انداز سمجھنے لگی تھی۔ اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی بات سے اختلاف کر کے اسے کہیں امان نہ ملے گی۔

''کہو بیٹا......! میرے ساتھ چلو گی نا......؟'' صالحہ نے دوبارہ محبت سے پوچھا۔

''نہیں......'' اس نے سر جھکا کر انکار کیا۔

''کیوں......؟''

''میں یہیں اماں کے پاس رہوں گی۔'' اس کے جواب سے زرینہ بیگم کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ جسے محسوس کر کے صالحہ سمجھ گئی کہ رابعہ اس کے ڈر سے انکار کر رہی ہے۔ اسے افسوس ہوا اور دکھ بھی لیکن وہ زیادہ اصرار نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی زبردستی اپنی بات منوا سکتی تھی۔ کیونکہ یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل تھی کہ رابعہ پر اس کا کوئی حق نہیں تھا جب کہ زرینہ بیگم کچھ حقوق لے بیٹھی تھی۔

صالحہ یہاں سے اٹھ کر گئی تو بہت آزردہ تھی۔ ایک تو مہرالنساء کی بے وقت موت، دوسرے رابعہ کی حالت نے اسے بہت دکھ پہنچایا تھا اور خضر سے ذکر کرتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔

''بعض لوگ اتنے حرماں نصیب کیوں ہوتے ہیں۔ خضر۔ اچھے دنوں کی آس میں اک عمر بتاتے ہیں اور پھر اچھے دنوں کے آنے سے پہلے ہی چل دیتے ہیں۔''

''اس میں ہمارا کوئی اختیار نہیں ہے۔ خدا جس کے نصیب میں جو لکھ دے۔'' خضر نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

''یہی دنیا کے رنگ ہیں صالحہ اور انہی مختلف رنگوں کی بنا پر ہمارے لیے اس دنیا میں کشش بھی ہے۔ یقین کرو اگر یہ صرف ایک ہی رنگ سے سجی ہوتی تو ہم بہت جلد اس سے اکتا جاتے۔ تم اپنے گھر کی مثال لے لو۔ کیا تم نے ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کو مختلف رنگ نہیں دیے۔ اسی طرح اس نے ہر انسان کے نصیب کو ایک الگ رنگ دیا ہے۔ کسی کے نصیب کو آسودگیوں کے رنگوں سے سجایا ہے اور کہیں محرومیوں کے رنگ بھر دیے ہیں۔''

''تم پلیز اس طرح مت روؤ۔'' پھر قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

''مہرو شاید جان گئی تھی کہ وہ زیادہ عرصہ حالات سے نہیں لڑ سکے گی۔ اور وہ بچوں کی طرف سے بہت فکرمند تھی، پھر میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو میں اس کے بچوں کا خیال رکھوں گی۔'' ذرا دیر رک کر کہنے لگی۔

''میں رابعہ کو لانا چاہتی تھی لیکن اس کی ماں نے نہیں آنے دیا۔''

''چلو......! تم نے تو اپنی سی کوشش کر دیکھی ناں...... اب دل پر بوجھ مت رکھو۔''

''لیکن خضر......! مجھے لگتا ہے، رابعہ اپنی سوتیلی ماں سے بہت خوفزدہ ہے جبھی اس نے میرے ساتھ آنے سے انکار کیا۔''

''یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے صالحہ......! اور تم ان کے معاملات میں اس حد تک دخل اندازی مت کرو کہ انہیں ناگوار گزرنے لگے۔ اور سنو۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ اس عورت نے رابعہ کو یہاں نہیں آنے دیا۔ ورنہ اس کے بہانے حق نواز اس گھر کا راستہ دیکھ لیتا اور جس قماش کا وہ آدمی ہے تو میں اس کا یہاں آنا کبھی بھی پسند نہیں کروں گا۔ اور تم سے بھی میں کہہ رہا ہوں کہ جب تک مہرالنساء تھی۔ میں نے تمہیں نہیں روکا لیکن اب تم وہاں نہیں جاؤ گی۔ اسے میرا حکم سمجھ لو۔''

''لیکن خضر......! وہ بچی۔''

''بس اب اس موضوع پر بات نہیں ہوگی۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا پھر اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔

○ ○ ○

وقت کروٹ پر کروٹ بدلتا چلا گیا۔

موسم بدلتے رہے۔

کبھی بہاروں نے خزاؤں کو اپنی آغوش میں سمیٹا اور کبھی خزاؤں نے بہاروں کا دامن تھاما۔

یونہی آنکھ مچولی کھیلتے برسوں بیتے۔

اور......

گزرتے برسوں نے جہاں صالحہ بیگم اور خضر حیات کو جوانی کی دہلیز پار کرا دی تو وہاں بچوں کو اس دہلیز پر لا کھڑا کیا۔

سب سے بڑے احتشام جو حال ہی میں ایم بی اے کر کے لوٹے تھے ان کے بعد حسام

میڈیکل کے آخری سال میں جب کہ نائلہ میڈیکل کے تیسرے سال میں تھی۔ پھر انعام تھا انجینئرنگ کے دوسرے سال میں اور آخر میں صبیحہ بی اے کی اسٹوڈنٹ تھی۔ سب اپنے اپنے راستے پر بڑی کامیابی سے چل رہے تھے۔ بے جی (صالحہ بیگم) نے ان سب پر بڑی محنت کی تھی اور یہ کچھ تو ان کی محنتوں کا ثمر تھا اور کچھ قسمت شروع ہی سے ان پر مہربان رہی تھی۔

بے جی نے شروع ہی سے گھر کی جو روٹین بنا رکھی تھی۔ اس کی پابندی اب بھی سب پر لازم تھی۔ صبح نماز کے وقت ہی سب بیدار ہو جاتے اور اس کے بعد سونے کی اجازت کسی کو نہ تھی۔ خواہ چھٹی کا دن ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ان کا حکم تھا کہ رات نو بجے سے پہلے سب کو گھر میں موجود ہونا چاہیے اور ٹھیک نو بجے وہ بیرونی گیٹ بند کروا دیتی تھیں۔

پچیس برسوں میں "الخضر" میں کافی تبدیلیاں ہوئیں۔ پہلے یہ صرف بڑا گھر تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ خضر حیات اسے جدید طرز سے تعمیر کرواتے گئے۔ اب یہ باہر سے جتنا خوبصورت تھا، اس سے کہیں زیادہ اس کی خوبصورتی اور سجاوٹ اندر سے دیکھنے کے قابل تھی۔ اور اس پورے الخضر پر بے جی کی حکمرانی تھی۔ اور یہ حکمرانی ان کا حق بھی تھا کہ اسے سجانے سنوارنے سے لے کر اس کے اندر کا پرسکون ماحول سب ان کی کاوشوں کا مرہون منت تھا۔ اور آج الخضر کی سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ رنگین قمقموں سے سجا یہ گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ اندر کے ماحول میں ایک خوشگوار سی ہلچل مچی تھی۔ ہال کمرے میں لڑکیاں ڈھولک پر گیت گانے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق میں مصروف تھیں۔ ان کے دبے دبے مترنم قہقہے باہر تک سنائی دے رہے تھے۔ یہ خوبصورت ہنگامہ احتشام کی شادی کے سلسلے میں تھا۔

جس دن احتشام ایم بی اے کر کے لوٹے تھے اسی وقت سے بے جی نے ان کے لیے لڑکیاں دیکھنی شروع کر دی تھیں۔ اور بالآخر ان کی نگاہ انتخاب صائمہ پر ٹھہری۔ گھر کے باقی افراد کو بھی صائمہ بہت پسند آئی تھی۔ اور یوں چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق جلد ہی یہ شادی طے پا گئی۔ گھر کی پہلی شادی تھی۔ اس لیے خوشی کے ساتھ ساتھ بوکھلاہٹ بھی سوار تھی کہ کہیں کسی بات میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

ایسے میں بے چارے حسام کی شامت آئی ہوئی تھی کہ جب بے جی کو کوئی چیز یاد آتی۔ اسی وقت اسے بازار بھیجتیں۔ وہ بے جی کے سامنے احتجاج نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن دبی زبان سے کئی بار کہہ چکا کہ آپ ایک ہی بار لسٹ بنا دیں۔ اب بھلا بے جی کو لسٹ بنانے کی فرصت کہاں تھی۔ بار بار کہتیں۔

"مجھے کوئی ایسا بہت سارا سامان تو منگوانا نہیں۔ بس یہی ایک دو چیزیں ہیں، لے آؤ۔"

وہ چلا جاتا اور اس کے جانے کے بعد انہیں ایک دو چیزیں اور یاد آ جاتیں۔

ابھی ابھی وہ لوٹا تھا اور اب پھر بے جی اس کے سر پر کھڑی تھیں۔ اس نے بہت آرام سے ان کی کلائی تھام کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"بے جی......! آپ کو میری حالت پر رحم نہیں آتا۔" وہ مسکین سی شکل بنا کر بولا۔

"بیٹے......! ایسے موقعے روز روز تو نہیں آتے۔"

"بے شک روز روز نہیں آتے لیکن کیا یہ ضرورت ہے کہ میں معمولی معمولی چیز کے لیے دوڑایا جاؤں۔ آخر آپ ایک ہی دفعہ لسٹ کیوں نہیں بنا لیتیں۔ اور اب تو بازار والے بھی مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔"

"کیا......؟" اس بات پر بے جی نے اسے گھورا۔

"ظاہر ہے جب دن میں دس چکر لگاؤں گا مشتبہ تو ٹھہروں گا ہی۔ اور اب موسم کے تیور دیکھ رہی ہیں آپ، لگتا ہے کسی پل بھی بارش برسنے لگی گی۔"

اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"چلو......اس سے پہلے کہ بارش شروع ہو جائے۔ تم نکل جاؤ۔"

"بے جی......!" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بے جی اٹھ کھڑی ہوئیں جس کا مطلب تھا۔ وہ مزید بحث نہیں کرنا چاہتیں۔

"اگر اجازت ہو تو ایک کپ چائے پی لوں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"پی لو......" انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہوں۔ اس کے بعد فوراً نکل جانا۔

وہ اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ بوا سے چائے بنوا کر وہیں کھڑے کھڑے پی پھر انہیں قدموں باہر نکل آیا۔ نائلہ اور صبیحہ برآمدے میں کھڑی موسم پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ وہ قریب سے گزرنے لگا تو نائلہ نے پکار لیا۔

"تم کہاں جا رہے ہو......؟"

"بازار......!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"غالباً ابھی تو تم بازار سے آئے تھے۔"

"غالباً نہیں یقیناً......"

"پھر......؟" نائلہ اس کا پھولا ہوا چہرہ دیکھ کر مسکرائی۔

"بے جی کی مہربانی ہے۔ انہیں میرا گھر میں بیٹھنا پسند نہیں آ رہا۔"

"اصل میں بے جی کو شبہ ہو گیا ہے کہ ہماری سہیلیوں کو۔"

''کیا......؟'' وہ نائلہ کی بات پوری ہونے سے پہلے چیخا۔ ''میں ایسا نظر آتا ہوں۔''

''نہیں میرے بھائی تم ایسے نظر تو نہیں آتے لیکن اب اندر کا حال تو ہم نہیں جانتے ناں جبکہ بے جی تو ایک نظر میں ہمارے اندر تک جھانک لیتی ہیں۔'' نائلہ اسے چھیڑنے کے موڈ میں تھی۔ صبیحہ نے اس کا ساتھ دیا۔ کہنے لگی۔

''میں نے بھی محسوس کیا ہے۔ حسام بھائی رومانہ کو دیکھ کر۔''

''خبردار......!'' اس نے صبیحہ پر مکا تان لیا پھر بے جی کو کمرے سے نکلتے دیکھ کر اس نے اپنی ہی ہتھیلی پر مکا دے مارا۔

''تم ابھی گئے نہیں۔'' بے جی کے لہجے میں سرزنش تھی۔

''میں جا رہا تھا بے جی! ان دونوں نے روک لیا۔''

''ہم نے......نہیں تو۔'' وہ صاف مکر گئیں تو وہ دونوں کو گھورتا ہوا جلدی سے برآمدے کی سیڑھیاں اتر گیا۔ گھر سے نکلا تو وہ خاصا جھنجھلایا ہوا تھا لیکن خوشگوار موسم نے بہت جلد اس کی جھنجھلاہٹ دور کر دی۔ ابھی اس کی گاڑی مین روڈ تک ہی آئی تھی کہ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی اور نم ہوا اس کے چہرے کو چھونے لگی تھی۔ وہ ہوا کی شوخی پر خاصا محظوظ ہوا اور سیٹی پر خوبصورت دھن بجاتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ قدرے بڑھا دی۔ وہ چاہتا تھا بارش تیز ہونے سے پہلے بازار کا کام کر لے۔ اور اس نے بہت جلدی میں بے جی کی بتائی ہوئی چیزیں خریدیں۔ پھر جس وقت وہ سامان سمیٹ کر گاڑی کی طرف آیا بارش جم کر برسنے لگی تھی۔ جلدی سے ہاتھوں میں پکڑی چیزیں پچھلی نشست پر پھینکیں اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

اتنی سی دیر میں وہ کافی بھیگ گیا تھا۔ انگلیوں کی مدد سے بالوں پر رکے بارش کے قطرے جھٹکنے کے بعد ٹشو پیپر سے چہرہ صاف کیا پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے شفاف سڑک پر لے آیا۔ اب اسے جلدی نہیں تھی۔ اطمینان سے ڈرائیونگ کرتا ہوا پناہ کی تلاش میں بھاگتے دوڑتے لوگوں کو دیکھنے لگا۔

یہ ایک دلچسپ نظارہ تھا جس نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ بارش بھی تو یوں برس رہی تھی جیسے اب کے بعد پھر کبھی نہ برسے گی۔ ونڈ اسکرین پر تیزی سے حرکت کرتے وائپر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ ایک لمحے میں ہی سامنے کا منظر دھندلا جاتا تھا۔ اس نے احتیاطاً اسپیڈ بہت آہستہ کر دی۔

یونہی بھٹکتی ہوئی اس کی نظریں بائیں جانب اٹھیں تو وہ چونک گیا۔ روڈ کے کنارے ایک لڑکی تنہا کھڑی تھی۔ بارش میں شرابور اپنے آپ میں سمٹی ہوئی کافی خوفزدہ بھی لگ رہی تھی۔ اس

نے گاڑی اس کے قریب جا کر روک دی اور اس کی طرف کا دروازہ کھول کر کہنے لگا۔

''آ جائیے محترمہ......! میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔'' گاڑی اس کے قریب روکنے اور اسے بیٹھنے کی پیشکش کرنے میں اس کے ارادے کو بالکل دخل نہیں تھا۔ لڑکی قدرے سہم کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اس وقت کوئی سواری نہیں ملے گی۔ اور بارش رکنے کا امکان بھی نہیں ہے۔''

لڑکی جواب دینے کے بجائے اپنے پیچھے یوں دیکھنے لگی جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو۔

''کوئی اور بھی ہے آپ کے ساتھ......؟'' وہ پوچھنے لگا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''کوئی اور ہے تو اسے بھی بلا لیں۔'' اس نے خلوص سے کہا۔ لڑکی خاموش رہی۔

''آپ سن نہیں سکتیں یا بول نہیں سکتیں......؟''

اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو وہ اسے گونگی بہری سمجھ کر اشارے سے کہنے لگا کہ آ کر گاڑی میں بیٹھ جائے۔ تھوڑی پس و پیش کے بعد وہ بیٹھ تو گئی لیکن اتنی خوفزدہ تھی کہ ایک لفظ شکریہ تک نہ کہہ سکی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی طرف کا دروازہ بند کیا پھر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ کچھ دیر تک خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ پھر اس سے پوچھنے کی غرض سے کہ اسے کہاں جانا ہے۔ گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ رخ موڑ کر شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے گونگی بہری سمجھ کر اس کے کندھے کو ہلکے سے چھو ڈالا۔ وہ ایک دم اس کی طرف پلٹی یوں جیسے کرنٹ چھو گیا ہو۔ آنکھوں میں خوف کے سائے آنسوؤں کی صورت لرزنے لگے تھے۔ اور بس ایک لمحہ تھا کہ وہ ان لبریز پیمانوں کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ وقت تھمتا ہوا لگ رہا تھا۔

دل ناداں نے بغاوت کا بگل بجاتے ہی سارے در وا کر دیے۔ اور وہ۔ سج، سج قدم اٹھاتی ایک کے بعد ایک دروازہ پار کرتی گئی یہاں تک کہ وہ مقام آ گیا جہاں تک ہر ایک کی رسائی ممکن نہیں۔

''میرے خدا......!'' وہ چونکا اور سنبھل کر سیدھا ہو بیٹھا۔ بس چند ساعتیں ہی تو بیتی تھیں اور وہ مسافتیں طے کر آیا تھا۔ جبکہ وہ حیران حیران سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''معاف کیجیے گا۔'' وہ کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''میں پوچھنا چاہتا تھا آپ کو کہاں جانا ہے؟''

''مزنگ......!'' اس نے بہت دھیمی آواز میں بتایا۔

''ارے آپ بول بھی سکتی ہیں۔'' وہ لہجے میں شوخی بھرنا چاہتا تھا۔ لیکن جانے کیوں ممکن نہ ہوا۔ وہ کیا کہتی پھر رخ موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ اور وہ بار بار کن اکھیوں سے اس کا جائزہ

لینے لگا۔ بھیگے بھیگے کپڑوں میں اس کا دلکش سراپا قدرے نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے لاپرواہ نہیں تھی۔ گیلی چادر سے کبھی سر ڈھانپتی اور کبھی گھٹنوں تک کھینچنے کی کوشش کرتی۔ کتنا راستہ خاموشی میں کٹ گیا۔

"پڑھتی ہیں آپ......؟" وہ یونہی بات کرنے کی غرض سے پوچھنے لگا۔

"جی......!" مختصر جواب۔ وہ انتظار کرنے لگا آگے بھی کچھ کہے گی لیکن اس نے اسی جواب کو بہت سمجھ لیا تھا۔

"آپ نے بتایا نہیں۔ کون سے ایئر میں ہیں۔" بالآخر اسے پوچھنا پڑا۔

"بی اے کا امتحان دوں گی۔"

"اچھا...... کس کالج میں ہیں......؟"

"کسی میں نہیں۔"

"میں پرائیویٹ امتحان دیتی آئی ہوں۔"

"کالج کیوں نہیں جاتیں......؟" وہ خاموش رہی اور وہ سمجھ گیا یقیناً کوئی مسئلہ ہے جسے وہ بتانا نہیں چاہتی۔ وہ سوچنے لگا۔ اب کیا بات کرے لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ یہاں تک کہ مزنگ آ گیا۔

"کس طرف جانا ہے......؟" اس کے پوچھنے پر وہ جو اپنے خیال میں بیٹھی تھی۔ بری طرح چونکی اور شیشوں سے باہر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اچانک بہت خوفزدہ ہو گئی ہے۔

"کیا بات ہے آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں۔ کیا میں غلط آ گیا ہوں۔"

"نہیں...... مجھے بس یہیں اتار دیں۔"

"میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں...... نہیں......" وہ جلدی سے بولی۔ "یہاں سے میں خود ہی چلی جاؤں گی۔"

"بارش زوروں پر ہے چند قدم بھی نہیں چل پائیں گی۔"

"مجھے زیادہ دور نہیں جانا۔ پلیز......!" لہجے میں التجا تھی اس نے گاڑی روک دی۔ اور اس کی طرف دیکھنے لگا اور دروازہ کھولنے سے پہلے وہ بھی اس کی طرف پلٹی۔ جھیل جیسی آنکھوں کو حصار میں لیے پلکیں اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر لرزیں اور ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔

"شکریہ......!"

"میں حسام ہوں اور آپ......؟"

"رابعہ......! رابعہ حق نواز......!"

اس نے کہا اور دروازہ کھول کر اتر گئی۔ اور وہ بہت دور تک اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ چند قدم کے بعد ہی چھاجوں برستے مینہ نے دھند کی چادر تان دی تھی۔

○○○

وقت کہیں نہیں رکتا۔ اس کا کام گزرنا ہے اور یہ گزر ہی جاتا ہے۔ اس گھر میں جہاں رابعہ پیدا ہوئی۔ یہاں بھی وقت پہلو بدلتا ہوا بہت سے ماہ و سال پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ ان گزرتے برسوں میں کوئی پل ایسا نہیں تھا جسے وہ زادِ راہ بنا سکتی اور نہ ہی آنے والے وقت کو سوچتے ہوئے کوئی امید کی کرن جگمگاتی تھی کہ جسے وہ اپنی گرفت میں لے سکتی۔

شروع کے ماہ و سال بہت کڑے تھے۔ زرینہ بیگم نے جو سلوک چاہا روا رکھا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ پھر جب زرینہ بیگم نے یکے بعد دیگرے چار بچوں کو جنم دیا تب اس کی طرف سے ذرا اس کی توجہ ہٹی۔ کچھ دن خود بچوں میں الجھی رہی پھر یہ ذمہ داری بھی اس کے سر ڈال دی۔ جسے نبھاتے ہوئے اس نے لڑکپن کو خیر باد کہا۔ اور لڑکپن سے نکلتے ہی وہ اپنی ماں مہرالنساء کا رنگ روپ چرا لائی۔ وہی رنگ، وہی سراپا، ویسی ہی جھیل سی آنکھیں، ویسے ہی تراشیدہ لب اور لبوں کے کنارے سیاہ تل جو دیکھنے والے کو مبہوت کر دیا کرتے تھے۔

اس گھر میں اس کی سوتیلی ماں زرینہ بیگم کا بیٹا نادر بھی تھا۔ جسے شروع میں اس کے ساتھ خاصی پرخاش رہی۔ جو بات بات میں اسے ٹوکتا اور اکثر ماں کی شہ پر گالیاں بھی دیا کرتا تھا۔ لیکن لڑکپن کے بعد اس کے انداز میں خود بخود تبدیلی آ گئی۔

وہ کسی تیسرے درجے کے عاشق کی طرح اس پر نثار ہونے لگا۔ یہ صورت حال اس کے لیے خاصی پریشان کن تھی۔ لیکن وہ کس سے کہتی کچھ کہنے کا مطلب اپنی ہی رسوائی تھی۔ وہ چپ چاپ اس کی حرکتیں نظرانداز کرتی رہی۔ سارا دن وہ گھر میں اس جگہ بیٹھتا جہاں وہ مسلسل اس کی نظروں کی گرفت میں رہتی۔ کبھی وہ اونچی آواز میں فحش فلمی گانے گاتا اور کبھی ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے مختلف جملے اس کی طرف پھینکتا۔

جانِ دل...... جانِ جگر اور جانِ من قسم کے القاب سے نوازتا اور ایک مستقل نام کٹاری تو ہر دم اس کے ہونٹوں پر رہتا۔

"ظالم دل پر پاؤں رکھ دیا ہے۔" اس کے ہر قدم پر یہ جملہ بولتا۔ شاید اپنے آپ کو کوئی ہیرو سمجھتا تھا۔ اور ہیرو کے انداز اپنانے میں ولن سے بھی بدتر ہو گیا تھا۔ لیکن ایک جگہ اس کی مہربانی

کام آ گئی کہ وہ جو اسٹور میں بند ہو کر اپنی پڑھی ہوئی کتابیں بار بار پڑھتی تھی ایک دن اس نے دیکھ لیا تو پوچھنے لگا۔

''بڑا شوق ہے تجھے پڑھنے کا......؟''

''ہاں......!'' اس نے سادگی سے اقرار کیا۔

''اور کتابیں لا دوں......؟'' پتا نہیں وہ مہربان تھا کہ قسمت۔ پہلے تو وہ غیر یقینی سے اس کی طرف دیکھے گئی۔ جب اس نے دوبارہ پوچھا تو کہنے لگی۔

''کیا واقعی تم مجھے اور کتابیں لا دو گے......؟''

''ارے تم کہو تو آسمان سے تارے توڑ کر لا دوں۔'' وہ پھر پٹڑی سے اترنے لگا تو وہ فوراً بول پڑی۔

''نہیں نادر بھائی......! تم تو بس مجھے کتابیں ہی لا دو۔''

پھر نہ صرف اس نے کتابیں لا دیں بلکہ اماں کو پتا چلا اور انہوں نے روکنا چاہا تو وہ اس کے سامنے ڈھال بھی بنا۔

''پڑھنے دے اماں......! کیا کرے گی پڑھ لکھ کر۔'' اور یہ اسی کی مہربانی تھی کہ وہ اب بی اے کی تیاری کر رہی تھی۔

کتابوں نے اسے اتنی آگاہی ضرور دی تھی کہ جس ماحول میں وہ رہ رہی تھی وہ اسے کسی طور بھی بہتر نظر نہیں آتا تھا۔ ابا نشہ کرتے کرتے اس حال کو پہنچ گئے تھے کہ خود اپنی پہچان کھو رہے تھے۔ اماں کا سارا غصہ اب ابا کی طرف منتقل ہو چکا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے انہیں نکھٹو پن کا طعنہ دیتیں۔ حالانکہ نکھٹو تو وہ ہمیشہ رہے۔ اس وقت بھی جب اماں نے ان سے شادی کی۔

چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ ہی اماں نے کبھی ان میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور نادر جس کا اپنا باپ پتا نہیں کیسا تھا لیکن وہ ابا یعنی حق نواز کے نقش قدم پر آنکھیں بند کر کے چل رہا تھا۔ ایک نشہ نہیں کرتا تھا باقی ساری عادتیں ان جیسی ہی تھیں۔

وہ اگر اس ماحول سے فرار کا سوچتی بھی تو ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے لیے سارے راستے ہی بے نشان تھے۔ وہ کس پر پاؤں رکھتی۔ بالآخر اسی کو مقدر جان کر سمجھوتا کر چکی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ذہن اسی حد تک رسائی حاصل کرتا کہ کبھی نادر اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کرے گا اور اماں اس کی خواہش کے آگے سر جھکاتے ہوئے اسے اس کے پلے باندھ دیں گی۔ اور رہنا تو پھر بھی یہیں تھا۔

پھر وہ اس چار دیواری سے باہر کا کیا سوچتی۔ اس کی سوچیں اسی چار دیواری کے اندر تک

کچھ دور ہیں۔ ہاں کبھی کبھی بھولے بھٹکے اسے فراز کا خیال آتا جو بچپن میں کہیں چلا گیا تھا۔ اور اس کے بارے میں بھی وہ زیادہ پر امید نہیں تھی۔ بس دعا کرتی وہ جہاں بھی ہو خیریت سے ہو۔

اور آج وہ کچھ کتابیں لینے کی غرض سے بازار گئی تھی وہ اکیلی کبھی نہیں نکلی تھی۔ نادر ہمیشہ اس کے ساتھ جاتا۔ آج بھی وہ اس کے ساتھ تھا۔ لیکن واپسی میں اس کے کچھ دوست مل گئے تو وہ اسے اسٹاپ پر چھوڑ کر خود دوستوں کے ساتھ جانے کدھر نکل گیا تھا۔ وہ اکیلی تھی اور پھر بارش نے بھی گھیر لیا۔ پھر حسام کی آمد اور اس کے ساتھ بیٹھ کر آنا۔ یہ سب کچھ اچانک ہو گیا تھا ورنہ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی زندگی میں کبھی کوئی ایسا واقعہ بھی رونما ہو جائے گا۔ گو کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن اس کے لیے بہر حال غیر معمولی تھی۔

رات جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو خاصی ڈسٹرب ہو چکی تھی۔ سوچیں منتشر ہوئیں اور دل راہ فرار ڈھونڈنے لگا۔ اس کا وجیہہ سراپا نگاہوں میں سماتے ہی اس کا شائستہ لہجہ کانوں میں رس گھولنے لگا۔

''ارے......! آپ بول بھی سکتی ہیں۔''

''میں حسام ہوں اور آپ......!''

کب کسی نے اسے آپ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ یہاں تو تو تڑاخ سے بات ہوتی تھی۔ اور اکثر گالیوں کے ساتھ۔ اور اس نے اس سے ہٹ کر کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اب جو کسی نے راستہ چلتے یوں عزت دے ڈالی تو وہ اپنے آپ میں معتبر ہونے لگی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا جب وہ اسے سوچتے سوچتے ہی سوئی تھی۔ اور شاید زندگی میں پہلی بار کسی خوبصورت خواب نے اس کی آنکھوں کا رستہ دیکھا تھا۔

شاید رات دیر سے سونے کا نتیجہ تھا کہ صبح معمول کے مطابق اس کی آنکھ نہ کھل سکی۔ ایک دو بار اماں نے آواز دی تو وہ کسمسا کر دوبارہ سو گئی۔

''اے رجو......! دیکھ اس کم بخت کو اٹھی کہ نہیں۔'' اماں کا مخصوص لہجہ شروع ہو گیا اور آواز اتنی اونچی تھی کہ وہ پوری طرح بیدار ہو گئی۔

''کیا ہوا......؟ اماں کیوں چلا رہی ہو......؟'' نادر کی آنکھ کھلی تو وہ جھنجلا کر پوچھنے لگا۔

''اس نامراد کو دیکھو۔ کل بارش میں بھیگتی ہوئی آئی ہے۔ کہیں مر مرا تو نہیں گئی۔''

اماں نے کہا تو اسے بارش میں بھیگنا یاد آیا اور جو ذرا سی حرکت کی تو جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔

''کون......؟ کس کی بات کر رہی ہو اماں......؟'' نادر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

''رابعہ کو دیکھو......کل تم ہی اسے لے کر گئے تھے۔''

"کیوں......؟ کیا ہوا اسے......؟"

"ابھی تک پڑی سو رہی ہے۔"

"تو کیا ہوا......سونے دے۔" وہ لاپروائی سے کہتا ہوا دوبارہ لیٹ گیا۔

"بڑے آرام سے کہہ رہا ہے سونے دے۔ یہاں ناشتا کیا تیرا باپ بنائے گا۔" اماں بڑبڑاتی ہوئی اس کے سر پر آ کھڑی ہوئیں اور اسے آنکھیں کھولے دیکھ کر حیرت اور غصے سے کہنے لگیں۔

"تو جاگ رہی ہے پھر بھی میری آواز نہیں آئی۔"

"اماں......! مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"کیوں......؟"

"بدن دُکھ رہا ہے۔"

"بارش میں بھیگے گی تو دکھے گا نہیں۔ چل اُٹھ ابھی بچے اُٹھ کر ہنگامہ مچا دیں گے۔" وہ حکم صادر کر کے چلتی بنیں اور اسے ناچار اٹھنا پڑا۔

کوئی آس نہیں بندھی تھی۔ نہ ہی امید کی کوئی کرن دل میں جگمگائی تھی لیکن ایک اجنبی کو وقت کو ہمسفر ہو کے اس کے خوابوں میں رنگ بھر گیا تھا۔ اور خواب رنگین کیا ہوئے کچھ مثبت سوچوں نے بھی ذہن میں جگہ بنانی شروع کی۔

کسے خبر کیا ہو جائے۔

کوئی معجزہ......

کوئی حادثہ......

شاید قسمت مہربان ہو جائے۔

شاید وقت کا ظالم پنجہ کہیں راستے سے پلٹ جائے۔ وہ بہت ساری باتیں فرض کرنے لگی تھی۔ اور غیر ارادی طور پر کسی ایک بات کے ہو جانے کی منتظر بھی تھی۔

آہٹوں پہ چونکنا۔ بیٹھے بیٹھے کھو جانا۔ اپنی کیفیت سے خود پریشان تھی۔ کہیں کوئی انداز اس کا اندر عیاں نہ کر دے۔ اور جو کسی کو خبر ہو گئی تو زندگی تنگ ہو جائے گی۔ اس وقت بھی روٹی پکاتے ہوئے اس کا ذہن گزرے کل میں الجھا ہوا تھا۔ جب نادر باورچی خانے کی چوکھٹ پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"کیا سوچ رہی ہو کنٹاری......؟" وہ ایک دم حقیقت کی دنیا میں آ گئی۔ کل تک وہ اس انداز اور اس لہجے کی عادی تھی لیکن اب اس سے برداشت نہیں ہوا۔ فوراً ٹوک دیا۔

"مجھے کنٹاری مت کہا کرو۔"

"کیوں......؟" وہ ہنسا......عجیب سی ہنسی۔

"اچھا نہیں لگتا۔"

"پھر کیا اچھا لگتا ہے تجھے......؟"

"کچھ بھی نہیں۔" طویل سانس لے کر اس نے بات ختم کرنی چاہی۔

"میں بھی نہیں۔" وہ یوں بولا جیسے اسے یقین ہو کہ وہ فوراً کہہ دے گی کہ تم اچھے لگتے ہو لیکن وہ خاموش رہی۔

"بتاناں......" اپنے تئیں محبت سے اصرار کرنے لگا۔ وہ رخ موڑ کر ابا کے لیے چائے بنانے لگی۔

"شرما رہی ہے۔" وہ واقعی یہی سمجھ رہا تھا۔ جبکہ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ دل چاہا بھاگ کر کہیں دور چلی جائے۔ جہاں اس کی بے باک نظریں نہ ہوں اور نہ ایسا لہجہ سننے کو ملے۔

"تم کل مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے......؟" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ مقصد اسکی باتوں کی طرف سے اس کا دھیان ہٹانا تھا۔

"کچھ یار دوست مل گئے تھے۔"

"انہیں ٹالا بھی جا سکتا تھا یا پھر پہلے مجھے گھر چھوڑ دیتے پھر ان کے پاس جاتے۔"

"اچھا سارا غصہ اسی بات کا ہے۔" وہ ہنسا اور وہ اس کی سمجھ پر حیران ہوئی۔ "چل معاف کر دے آئندہ تجھے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"میرے خدا......!" اس کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ بمشکل ضبط کرتی ہوئی ابا کا ناشتا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"راستہ......دو میں ابا کو ناشتا دے آؤں۔" وہ چوکھٹ پر مزید ہاتھ پھیلا کر بیٹھ گیا۔

"نادر بھائی......! چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"تو میں کیا کروں......؟"

"راستہ چھوڑو......"

"دل پر پاؤں رکھ کر نکل جا......" وہ ایک ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے بولا اور اسی موقعے سے فائدہ اٹھا کر وہ نکل آئی۔

ابا اپنے مخصوص کونے میں بیٹھے تھے۔ اس نے چائے کا پیالہ اور روٹی کی پلیٹ ان کے سامنے رکھ دی۔

"ابا......! ناشتا کرلیں۔" اس نے انہیں متوجہ کیا تو وہ خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ گو کہ وہ ان نظروں کی عادی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کے مخاطب کرنے پر اسی طرح دیکھا کرتے تھے لیکن اس وقت کیونکہ دل بوجھل ہو رہا تھا اس لئے وہ آزردہ ہوگئی۔

"اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں ابا......؟"

"تو کیوں میرا خیال رکھتی ہے......؟"

"میں خیال نہیں رکھوں گی تو کون رکھے گا۔" وہ دھیمی آواز میں بولی لہجے میں آنسوؤں کی نمی بھی شامل تھی۔

"جب میں نے تم لوگوں کا خیال نہیں رکھا تو تم بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"میں آپ سا دل کہاں سے لاؤں ابا۔ اور پھر میرے لیے ایک آپ ہی تو ہیں۔"

اس کے آنسو روانی سے بہہ نکلے جنہیں وہ جلدی سے دوپٹے کے پلو میں جذب کرنے لگی۔

"رابعہ، وہیں چپک گئی ہے کیا......؟" اماں نے شور مچانا شروع کر دیا تو وہ ابا کو ناشتا کرنے کا کہہ کر ان کے پاس سے اُٹھ آئی۔

"کیا سازش کر رہی تھی ابا کے ساتھ۔" اماں مشکوک انداز سے بولیں۔

"ابا سے کیا سازش کروں گی۔ انہیں تو اپنا ہی ہوش نہیں ہے۔" اس نے سوچا اور جلدی جلدی چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے ناشتا بنانے لگی۔

پھر اگلے دو دن وہ اپنے آپ کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی کہ جو زندگی وہ گزار رہی ہے، وہی اس کا مقدر ہے اور اس سے فرار کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ لیکن حسام کا خیال اتنا زور آور تھا کہ وہ اپنے آپ کو سمجھانے میں ناکام ہوگئی۔

شاید کوئی حادثہ، کوئی معجزہ......اسے ایک بار پھر میرے مقابل لا کھڑا کرے۔ دل نے اسی خیال پر گرفت مضبوط رکھی اور اس نے دل کے آگے ہار مان لی۔

○ ○ ○

کل تک وہ بازاروں کے چکر لگا کر عاجز آچکا تھا لیکن اب وہ بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ بار بار بے جی سے پوچھتا اور کوئی کام، کوئی چیز رہ گئی ہو تو میں ابھی لا دیتا ہوں اور بے جی تو وہ ماں تھیں جو ایک نظر دیکھ کر ہی اولاد کے اندر کا حال جان لیا کرتی تھیں۔

"کیا بات ہے......؟ کل تک تو جان چھڑا رہے تھے۔ اب بازار میں کیا کشش پیدا ہوگئی ہے۔"

"کشش......؟ کیسی کشش......؟" وہ بوکھلایا۔

"پھر بازار کیوں جانا چاہ رہے ہو جبکہ دکانداروں کی نظروں میں مشتبہ بھی ٹھہر چکے ہو۔" بے جی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بھی تھی۔

"کمال کرتی ہیں آپ بے جی......! ایک تو میں اپنی خدمات پیش کر رہا ہوں اوپر سے آپ مجھ پر شک بھی کر رہی ہیں۔"

دل میں چور تھا جبھی وہ خواہ مخواہ جھنجلانے لگا۔ اور بے جی قبل از وقت بات کرنے کی عادی نہیں تھیں اس لیے اس بات کو یہیں ختم کرتے ہوئے اٹھ کر چلی گئیں۔

"جواب نہیں بے جی کا......؟" اس نے سوچتے ہوئے سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔

عجیب بے کلی سی تھی اور اضطراب۔ ساتھ ہی کچھ کھو دینے کا لطیف سا احساس جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ لیکن یہ یقین کامل تھا کہ منزل وہی تھی جسے وہ بیچ چوراہے میں اتار آیا تھا۔

"رابعہ حق نواز......!" سینکڑوں بار اس نام کو دہرا چکا تھا لیکن ہونٹوں کی تشنگی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

"وہ یقیناً مزنگ میں رہتی ہے۔" وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا اور کبھی وہاں سے گزرتے ہوئے اس سے دوبارہ سامنا ہو سکتا ہے۔ اور پھر کبھی کیوں......ابھی کیوں نہیں۔ اس نے سوچا۔ فیصلہ کیا اور اُٹھ کر چل پڑا۔ لیکن ابھی کمرے سے نکلا ہی تھا کہ بے جی نے بلا لیا۔ وہ کندھے اُچکاتا ان کے پیچھے ان کے کمرے میں چلا گیا۔ بابا بھی موجود تھے۔

"تم فارغ ہو......؟" بابا اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگے۔

"جی......!" اس نے سعادت مندی سے کہا۔

"میرے دوستوں کے یہ کارڈز رہ گئے ہیں۔ اگر تم انہیں پہنچانے کا کام کر سکو تو۔" بابا کی عادت تھی۔ وہ کام بھی کہتے تھے اور اسے کرنے نہ کرنے کا اختیار بھی دوسرے کو سونپ دیتے تھے۔

"کیوں نہیں بابا......! میں ضرور پہنچا دوں گا بلکہ ابھی چلا جاتا ہوں۔" اس نے کارڈز بابا کے ہاتھ سے لیے اور اسی وقت باہر نکل آیا۔

پھر پہلے اس نے تمام کارڈز مطلوبہ لوگوں تک پہنچائے اس کے بعد واپسی میں وہ مزنگ سے ہوتا ہوا آیا، گو کہ اسے یقین نہیں تھا کہ اتنی جلدی وہ دوبارہ نظر آئے گی لیکن محض دل کے کہنے پر وہ ادھر سے گزرا تھا۔

پھر چند دن احتشام بھائی کی شادی میں گزر گئے اور مزید چند دن زندگی کے معمول میں آنے میں لگے۔ اور جب سب اپنی پرانی روٹین پر چلنے لگے تب اسے رابعہ کا خیال آیا۔ اور اس

سے دوبارہ ملنے کی خواہش دل میں سر ابھارنے لگی۔ وہ کوئی ایسا رنگین مزاج یا دل پھینک قسم کا بندہ نہیں تھا۔

شروع سے کو ایجوکیشن میں پڑھتا آیا تھا اور اب بھی میڈیکل کالج میں لڑکیوں کے ساتھ ہی پڑھ رہا تھا۔ لیکن کبھی کسی لڑکی نے اسے اتنا متاثر نہیں کیا تھا جتنا کہ وہ کر گئی تھی کچھ وقت ہی اس کی ہم سفری میں کٹا تھا اور وہ ہمیشگی کی ہمسفری کی تمنا کر رہا تھا۔ وہ اس کی تلاش میں مارا مارا تو نہیں پھر رہا تھا۔ بس اتنا تھا کہ اس نے اپنا راستہ وہی بنا لیا تھا۔ جہاں اسے چھوڑا تھا۔ کالج سے واپسی پر وہ اس راستے سے آتا۔ اور وہاں سے گزرتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ آپ ہی آپ ہلکی ہو جاتی اور نظریں زاویہ بدلتی چلی جاتی تھیں۔ لیکن وہ وہاں کبھی نظر ہی نہیں آئی۔ وہ مایوس تو نہیں ہوا تھا بس تھوڑا سا ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ اور ڈسٹربنس کے بعد جب جھنجلاہٹ کا مقام آنے لگا تو وہ نظر آ گئی۔ وہاں نہیں جہاں وہ اسے تلاش کیا کرتا تھا۔ بلکہ وہ اسے ایک کالج کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ اور اسے کالج کے سامنے کھڑی دیکھ کر یاد آیا کہ صبیحہ بھی آج کل بی۔اے کا ایگزام دے رہی ہے۔ اس نے گاڑی بالکل اس کے قریب جا روکی۔ وہ کیونکہ مخالف سمت دیکھ رہی تھی اس لیے متوجہ نہیں ہوئی۔ اور وہ اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ پکار لے یا اس کے خود ہی متوجہ ہونے کا انتظار کر لے لیکن اب انتظار مشکل تھا۔ اس کی طرف کا شیشہ اتارتے ہوئے اس نے بے اختیار پکار لیا۔

"رابعہ......!"

"رابعہ......!" اس کے پکارنے پر وہ چونک کر پلٹی اور اس پر نظر پڑی تو کتنی دیر تک حیران اور گم صم کھڑی رہ گئی۔ اس لیے کچھ دیر پہلے وہ کسی دوسرے پر اسی کا گمان کر کے تو جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھ رہی تھی اور وہ یہاں موجود تھا۔ اس کے سامنے اس کے قریب ہی۔ حیرت سے نکل کر اس کی آنکھوں میں شناسائی کے رنگ ابھرے۔ دروازہ بھی کھول دیا۔

"اس دن کے بعد میرا بیشتر وقت آپ کو ڈھونڈنے میں گزرا ہے۔"

"شاید آپ نروس ہو رہی ہیں۔" وہ کن انکھیوں سے اس کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولا جن کی انگلیاں ایک دوسرے میں پناہ گزیں ہونے کے باوجود ہلکے ہلکے لرز رہی تھیں۔

"جی!" وہ آواز کی لرزش پر بھی قابو نہ پا سکی۔

"پیپر کیسے ہو رہے ہیں......؟" وہ اسے نارمل کرنے کی غرض سے بولا۔

"ٹھیک ہو رہے ہیں۔"

"اس کے بعد کیا ارادہ ہے......؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔" پھر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ خود بات

کرے اور کتنی دیر تک وہ منتظر رہا اور وہ کیا بات کرتی یہی بہت بڑی بات تھی کہ وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ گو کہ اندر ہی اندر بہت خوفزدہ تھی۔ دیکھ لیے جانے کا ڈر جس کا ہلکا سا عکس اس کے چہرے پر بھی جھلک رہا تھا۔

"رابعہ......! کچھ کہیں ناں......!" بالآخر اسے کہنا پڑا۔

"کک...... کیا......؟" وہ اپنے خیال سے چونکی۔ "کیا کہوں......؟"

"چلیے یہ بتائیں، آئندہ ملاقات کب ہوگی......؟"

"شاید کبھی نہیں۔" وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی اور اس کا پاؤں ایک دم بریک پر چلا گیا۔ گاڑی سائڈ میں روکتے ہوئے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ......؟" وہ بے تابی سے پوچھنے لگا اور وہ رخ موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

"رابعہ......! ادھر دیکھیں میری طرف۔" وہ اس کی طرف پلٹی تو آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"کیا آپ خود دوبارہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتیں......؟" وہ خاموش رہی۔

"کوئی پرابلم ہے......؟" پھر خاموشی۔

"کہیں انگیج ہیں......؟"

"نہیں......"

"پھر......!"

"بس میں نہیں مل سکوں گی۔"

"آخر کیوں......!" اس کا اصرار بڑھا اور وہ رونے لگی۔

"رابعہ پلیز......! وہ پریشان ہوگیا۔ "اس طرح مت روئیں مجھے بتائیں کیا بات ہے؟"

وہ کیسے کہے، میں حالات کا شکار مجبور لڑکی ہوں۔ خودداری آڑے آئی اور وہ آنسو پونچھ کر خاموش ہوگئی۔

"تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے رابعہ گزشتہ چند دنوں میں، میں نے صرف تمہیں سوچا ہے۔"

وہ آپ سے تم پر آیا تو اپنے رتجگوں کا احوال سہولت سے کہہ سنایا۔ اس کا دل چاہا وہ بھی کہہ سنائے۔ وہ سارے خواب جو جاگتی آنکھوں نے دیکھے۔ وہ ساری باتیں جو اس کے حوالے سے سوچیں۔ وہ دل کی بے قراریاں۔ نیند کو ترسی آنکھیں۔ اور کسی معجزے کے رونما ہونے کی دعائیں۔ لیکن وہ کیسے کہے۔ کہیں وقت کا ظالم پنجہ ان لمحوں کو ہی نہ دبوچ لے جو زاد راہ کے طور پر

اس کی جھولی میں آن گرے تھے۔

"رابعہ......! کوئی آس تو دلاؤ۔" اس نے گاڑی پھر سائڈ میں روک لی۔

"آس......!" اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور وہ سوچنے لگی۔ میں تو خود کبھی امید کے دیے روشن نہ کر سکی پھر تمہیں کیا آس دلاؤں۔

"رابعہ......!" وہ اس کی پرسوچ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "تمہارا خیال میرے لہو کے ساتھ گردش کرنے لگا ہے۔ میں اسے کسی طور مٹا نہیں سکتا۔ تم میری اولین تمنا ہو اور میں......"

اس کی بات ہونٹوں میں رہ گئی۔ کسی نے آ کر رابعہ کا بازو پکڑ کر کھینچا تھا۔ رابعہ کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔ اور بدن خوف سے کانپنے لگا۔

"الو کی پٹھی، کون ہے یہ تیرا......" اس کا لہجہ انتہائی گھٹیا اور آواز اونچی تھی۔

"رابعہ کون ہے یہ......؟" حسام پوچھنے لگا۔ وہ کیا جواب دیتی پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکی۔

"چلتی ہے یا......؟"

اف اتنی بے عزتی...... وہ جلدی سے اس کی طرف مڑ گئی۔ اس کے زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے حسام نے سوچا کہ وہ اتر کر معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کرے لیکن اس سے پہلے ہی وہ اسے گھسیٹتا ہوا ٹیکسی میں جا بیٹھا دوسرے ہی لمحے ٹیکسی روانہ ہو گئی اور وہ کتنی دیر تک وہیں رکا دور جاتی ہوئی ٹیکسی کو دیکھتا رہا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تب وہ چونکا اور کچھ دیر بعد جب سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو احساس ہوا کہ یہ سب جو اچانک ہو گیا۔ وہ کچھ اچھا نہیں ہوا اور وہ کیوں بزدلوں کی طرح بیٹھا رہا۔ کیوں نہ بڑھ کر اسے روک لیا۔ اس کے ساتھ پشیمانی اور کھو دینے کے احساس نے اسے آزردہ کر دیا۔



نادر کی گرفت اب بھی اس کی کلائی پر سخت تھی اور وہ اسے اسی طرح گھسیٹتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا۔

"ابا......!" ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق وہ اس بے حس وجود کو پکار گئی۔ اس کی آواز میں جانے کیا تھا کہ گھٹنوں سے سر اٹھا کر ابا اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"ابا......!" نادر نے غصے سے اس کی نقل اتاری اور اندر لے جا کر اماں کے سامنے پٹخ دیا۔

"کیا ہوا......؟" اماں ناگواری سے پوچھنے لگیں۔

"اس آوارہ سے پوچھیں کس یار کے ساتھ بیٹھی تھی۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور خود ہی پوچھنے لگا۔

"کیا کون تھا......؟ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"نہیں......" اس کے منہ سے سسکی کی صورت میں آواز نکل گئی۔

"بتاؤ ورنہ تیری بھی ہڈیاں توڑ کر ایک کونے میں ڈال دوں گا۔"

"میں نہیں جانتی۔" وہ رونے لگی۔

"نہیں جانتی۔" نادر نے اس کے بالوں کو جھٹکا دینے کے ساتھ منہ پر تھپڑ بھی دے مارا۔ "ایک عرصے سے تمہیں دیکھ رہا تھا۔ جس طرح وہ اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس سے تو لگتا ہے کہ بہت عرصے سے اسے جانتی ہے۔"

"نہیں...... میں بالکل نہیں جانتی۔" اس کا انکار نادر کو مزید طیش دلا گیا اور وہ ہاتھ چلانے لگا۔

"کیا کرتے ہو۔" اماں نے بمشکل اسے روکا۔ "اور اب کیوں مارتے ہو، تمہیں ہی شوق تھا اسے پڑھانے کا۔ ورنہ میں تو پہلے دن سے خلاف تھی۔"

"مجھے کیا پتا تھا کہ یہ پر نکالے گی۔ شکل سے تو اتنی معصوم لگتی ہے۔"

"اندر سے گھنی ہے مکار۔" اماں کو موقع مل گیا۔

"اس کی ساری مکاری تو میں نکالوں گا۔" اس نے پھر مارنے کے لیے ہاتھ بلند کیا۔ لیکن اماں نے روک دیا۔

"ہاتھ روک کے...... پرائی لڑکی ہے۔"

"پرائی ہے۔ ابھی میرے ساتھ نکاح پڑھواؤ وہ پھر اپنی ہو جائے گی تو......"

"نہیں......" وہ چیخی۔

"کیا نہیں......؟" وہ اسے اونچی آواز میں چیخا پھر اماں سے کہنے لگا۔

"اماں...... بس جلدی سے انتظام کرو۔ اس کبوتری کے پر نکلنے لگے ہیں۔"

"اچھا...... اچھا......!" اماں نے ٹالنا چاہا۔

"ٹالو مت اماں...... آج ہی انتظام کرو۔"

"پاگل ہو گیا ہے کیا...... اتنی جلدی کیسے انتظام کروں۔"

"بس قاضی ہی کو تو بلانا ہے، ابھی بلا لاتا ہوں۔"

"جگ ہنسائی کرائے گا کیا......؟ دو چار دن صبر کر۔"

"اس سے زیادہ نہیں۔" اس نے کہا اور پھر اسے اٹھا کر اس اسٹور میں لے گیا جہاں اس کا بوریا بستر تھا۔

"خبردار......! اب یہاں سے نکلنے کی کوشش مت کرنا، ورنہ......!" دھمکی دیتا ہوا واپس پلٹ گیا اور وہ فرش پر بچھے گدے پر گر گئی اور اپنی بلند ہوتی سسکیوں کو دبانے کی خاطر تکیے میں منہ چھپا لیا۔ آنسو کسی طرح رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ جتنا آنکھیں رگڑتی۔ بہے چلے جاتے۔ ایک سیلاب تھا، جس پر بند باندھنے کی اس کی ساری کوششیں ناکام ہو گئی تھیں۔

کوئی شفیق آغوش جو میرے وجود کو اپنی پناہوں میں لے لے۔ کوئی مہربان کاندھا جس پر سر رکھوں تو آنکھوں سے بہتا سیلاب تھم جائے۔

اس کا تڑپتا مچلتا دل صدائیں دینے لگا۔ ابا......! ابا......! اگر جو کوئی حس زندہ ہوتی تو اس کی بے آواز صدائیں بھی رنگ لاتیں لیکن وہ تو ہر احساس سے عاری تھے۔

"امی......! امی!......" اسے امی (مہر النساء) بے طرح یاد آئیں اور احساس محرومی شدت سے تڑپانے لگا۔ وہ مچل مچل کر روتی رہی۔ کوئی آنسو پونچھنے نہیں آیا۔ دوپہر ڈھلی تو اماں نے وہیں سے پکار کر کہا۔

"ارے......! کب تک پڑی رہو گی، اُٹھ کر کھانے کی فکر کرو۔" اس کا دل چاہا صاف منع کر دے یا اس آواز پر کان ہی نہ دھرے لیکن اتنی ہمت کہاں سے لاتی۔ چپ چاپ نکل کر کچن میں چلی گئی۔ شدت گریہ سے آنکھیں سوج گئی تھی، سر الگ درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ چولہے کے سامنے کھڑی ہوئی تو آگ کی تپش براہ راست آنکھوں پر اثر انداز ہونے لگی۔ کاش اتنا حق اسے بھی ہوتا جو وہ کہتی مجھ سے یہاں نہیں کھڑا ہوا جا رہا۔ میری آنکھیں جل رہی ہیں لیکن سارے حقوق تو امی کے ساتھ ہی دفن ہو گئے تھے۔ بڑی مشکل سے سالن پکایا اور ابھی روٹی پکانی شروع ہی کی تھی کہ نادر آ گیا۔ وہ اس کے سر پر آ کھڑا ہوا تھا اور ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے آپ میں کٹنے لگی۔ اندر ہی اندر ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں وہ پھر حسام کے بارے میں نہ پوچھنا شروع کر دے اور وہ سارے ستم سہہ سکتی تھی، لیکن حسام کے بارے میں نہیں بتا سکتی تھی۔

"میں نے تجھے اسٹور سے نکلنے کو منع کیا تھا۔" کافی دیر تک اس کا جائزہ لینے کے بعد کہنے لگا۔

"اماں نے روٹی پکانے کو کہا ہے۔" وہ مری مری آواز میں بولی۔

"اماں تو بس ایسی ہی ہے۔ کم از کم یہ دو دن تو تجھے آرام کرنے دے۔" وہ ایک دم سر اٹھا کر

اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ ایک آنکھ بند کرتے ہوئے بولا۔

"خیر......! کوئی بات نہیں، شادی کے بعد میں تجھے کچھ آرام دے دوں گا۔"

اس کے دل میں لہری اٹھی جسے دبانے کی کوشش میں اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

"کیوں بڑی تکلیف ہو رہی ہے......؟" وہ سنگدلی سے بولا۔ وہ کیا کہتی، بالکل غیر محسوس طریقے سے اس کی طرف سے رخ موڑ گئی، پھر روٹی پکاتے ہی اس نے حسب معمول سب سے پہلے ابا کے سامنے کھانا لے جا کر رکھا۔

"ابا......! کھانا کھا لیں۔" سر جھکائے ہوئے اس نے کہا۔

"رابعہ......!" ابا کا ہاتھ اس کے سر پر آ ٹھہرا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

شاید کوئی معجزہ یا حادثہ کچھ تو تھا جو ابا کے گرد بنا بے حسی کا جال ٹوٹتا نظر آ رہا تھا۔

"ابا......!" سر پر سائبان کا احساس ہوا تو آنکھیں ایک بار پھر جل تھل ہو گئیں۔

"رومت......" ابا نے اس کے سر کو ہلکے ہلکے تھپکا۔ اب شفیق آغوش بھی تھی اور مہربان کاندھا بھی۔ گو کہ اماں اور پھر نادر کے ڈر سے وہ نہ شفیق آغوش میں چھپ سکتی تھی اور نہ مہربان کاندھے پر سر رکھ کر رو سکتی تھی، پھر بھی یہ احساس ہی بہت تھا کہ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ اسے میسر آ گئی تھیں۔ جبھی پلکوں کو ذرا سا جھپکا اور سیلاب تھم گیا۔

"تیری اماں اور نادر کہاں ہے......؟" ابا نے سرگوشی میں پوچھا۔

"اندر ہیں۔" اس نے کمرے کی طرف اشارا کیا۔

"سن میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا، اس لیے کہ مجبور ہوں۔ مجھ میں اتنی طاقت ہی نہیں کہ تیری طرف بڑھتے ہاتھ کو روک سکوں۔" وہ خاموشی سے سر جھکا گئی۔

"میں تیرا باپ ہوں پھر بھی تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے نکل جا۔"

"ابا......!" وہ سہم کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"ڈرمت......! میری بات غور سے سن میں ٹھیک طرح سے نہیں جانتا لیکن اتنا معلوم ہے کہ خضر حیات اور صالحہ بیگم گلبرگ میں رہتے ہیں اور خضر حیات کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ گلبرگ میں کسی سے بھی اس کا پتا معلوم کر لینا۔"

"میں کیا کہوں ان سے......؟"

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، صالحہ بیگم سے صرف اتنا کہنا کہ تو مہر النساء کی بیٹی ہے اور بس!"

"صالحہ بیگم......!" اس نے دُہرایا اور اچانک ذہن کہیں پیچھے سفر کرنے لگا۔

"رابعہ.....!" ابا نے فوراً اسے جھنجوڑا۔ "اس سے پہلے کہ کوئی باہر نکلے تو چلی جا۔"

"لیکن ابا.....!" اب ابا کو چھوڑ کر جانے پر دل آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔

"میں کہتا ہوں جا، ورنہ یہ لوگ تیری زندگی کو عذاب بنا دیں گے۔"

اس نے جھک کر ابا کے ہاتھوں کو ہونٹوں اور پھر آنکھوں سے لگایا اور طویل سانس لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیرونی دروازہ کھلا تھا۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

○○○

شام میں وہ یونہی بلا مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ ذہنی طور پر وہ بہت اپ سیٹ تھا۔ رہ رہ کر رابعہ کا خیال آتا اور وہ شخص جو شکل سے ہی اوباش نظر آتا تھا، جب اس کے سامنے اتنے گھٹیا لہجے میں بات کر رہا تھا تو گھر لے جا کر تو جانے کیا سلوک کیا ہوگا۔ وہ اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ رابعہ سے اس کا کیا ناتا ہوگا۔ بہر حال اسے زیادہ فکر رابعہ کی طرف سے تھی۔

ان چند دنوں میں وہ اسے اتنی عزیز ہو گئی تھی اور اتنی اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی کہ وہ اس کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سوچنا چاہتا تھا اگر اسے اس کے گھر کا پتا ہوتا تو شاید وہ وہاں تک جانے کا رسک بھی لے لیتا۔ کئی بار اس نے گاڑی مزنگ کے راستے پر ڈالی اور اس کے آس پاس کے علاقے میں بھی چکر لگایا لیکن ہر بار مایوسی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

کیا کرے اور کیا نہ کرے، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

شام گہری ہو کر رات میں بدل رہی تھی۔ وہ ذہن کو پرسکون کرنے کی خاطر ایک اوپن ایریا میں آ بیٹھا۔ تازہ ہوا نے دل و دماغ کے بوجھل پن کو قدرے دور کیا تو وہ نئے سرے سے آج کے واقعے کو سوچنے لگا۔ لیکن آخر میں پھر ذہن الجھ گیا اور ان الجھی سوچوں کو سلجھاتے سلجھاتے بہت دیر ہو گئی۔ وہ تو اچانک اس کی نظر کلائی میں بندھی گھڑی پر پڑی تھی۔

نو بجنے میں بس چند ہی منٹ تھے اور بے جی کا حکم تھا نو بجے سے پہلے سب کو گھر میں موجود ہونا چاہیے۔

وہ ساری سوچیں جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا اور بڑی عجلت میں گاڑی تک آیا بے جی کی خفگی کا خیال ہر خیال پر حاوی ہو گیا تھا، اس لیے اس نے گاڑی فل اسپیڈ پر چھوڑ دی۔ ساتھ ساتھ گھڑی بھی دیکھتا جا رہا تھا۔

دائیں ہاتھ کو مڑتے ہوئے اس نے بس ایک پل کو ہی گھڑی کی طرف دیکھا تھا اور دوسرے لمحے سامنے دیکھتے ہی وہ بوکھلا گیا۔ جانے کون اچانک اس کی گاڑی کے سامنے آ گیا تھا گو کہ اس

نے فوری طور پر بریک پر پاؤں رکھا تھا پھر بھی حادثہ ہو چکا تھا۔

ایک لمحے کو اس نے سوچا، وہ گاڑی بھگا لے جائے لیکن سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ نیچے اتر کر دیکھا، وہ کوئی لڑکی تھی۔ اس نے قریب جا کر اسے کندھوں سے تھام کر سیدھا کیا تو جہاں آنکھوں میں ڈھیروں حیرت سمٹی وہاں ہونٹوں نے حرکت کی۔

"رابعہ.....!" اس کا گال تھپکتے ہوئے پکارا، پھر نبض پر ہاتھ رکھا۔ شاید بے ہوش تھی۔ جیب سے رومال نکال کر پیشانی سے بہتا خون صاف کیا۔

"ہاسپٹل لے جاؤں۔" اس نے سوچا پھر فوراً ہی اپنے خیال کی نفی کر دی۔

"یہ کام تو میں خود بھی کر سکتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اسے بازوؤں پر اٹھا کر پچھلی سیٹ پر لٹایا اور خود جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

جس وقت وہ گھر میں داخل ہوا بے جی ہاتھ میں تسبیح لیے برآمدے میں ٹہل رہی تھیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کیونکہ اس وقت اس کی پوزیشن بڑی خراب تھی۔ ایک تو لیٹ دوسرے بازوؤں پر لڑکی، وہ بھی خوبصورت سی۔ بڑی مشکل سے وہ برآمدے کی چار سیڑھیاں چڑھ سکا۔ بے جی، اس وقت ٹہلتی ہوئی برآمدے کی آخری حد پر چلی گئی تھیں۔ وہاں سے پلٹیں تو اسے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

صورتِ حال واقعی خاصی نازک تھی۔ دل چاہ رہا تھا زمین پھٹے اور وہ رابعہ سمیت اس میں سما جائے۔

"کون ہے یہ.....؟" چند قدم آگے آ کر بے جی نے نہایت سرد لہجے میں پوچھا۔

"وہ بے جی.....! یہ....." اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

"کون ہے.....؟" بے جی کا انداز ایسا تھا جیسے جتا رہی ہوں کہ وہ سوال دہرانے کی عادی نہیں ہیں۔

"میں نہیں جانتا۔" اس نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔

"پھر.....؟"

"یہ اچانک میری گاڑی کے سامنے آ گئی تھی۔" دل قابو میں آیا تو وہ تفصیل بتانے لگا۔

"زخمی ہے.....؟" اس کی پوری بات سننے کے بعد پوچھنے لگیں۔

"آؤ میرے ساتھ....." وہ ان کے پیچھے چل پڑا۔ بے جی اسے لے کر نائلہ کے کمرے میں آ گئیں اور بیڈ پر لٹانے کا اشارہ کیا۔ اس نے فوراً اسے لٹا دیا اور نائلہ کی آنکھوں میں ابھرتے سوال نظر انداز کرتے ہوئے اسے فرسٹ ایڈ باکس لانے کے لیے کہا۔

ایک سال کے عرصے میں وہ ڈاکٹر بننے جا رہا تھا لیکن اس وقت بے جی کی موجودگی میں اس کی بینڈیج کرتے ہوئے اس کے ہاتھ بری طرح لرز رہے تھے، جسے بے جی بھی صاف طور پر محسوس کر رہی تھیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ طویل سانس لیتے ہوئے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''یہ بے ہوش کیوں ہے؟'' بے جی کی نظریں رابعہ کے چہرے پر جمی تھیں۔

''خوف سے......''

''کیا مطلب......؟''

''اچانک حادثے سے خوفزدہ ہوئی ہے یا پھر کوئی اور بات ہے۔''

''کوئی اور بات......؟'' بے جی نے آہستہ سے دہرایا اور اچانک ان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وہی نقش، وہی رنگ و روپ، جیسے مہر النساء سامنے آ گئی ہو۔

''اسے فوراً ہوش میں لاؤ۔'' بے جی کے لہجے میں بے تابی چھلک آئی۔ اس نے نائلہ کو اشارہ کیا تو وہ انجکشن تیار کرنے لگی...... اور جب وہ اسے انجکشن لگا کر ہٹا تو بے جی نے اسے باہر جانے کے لیے کہا۔

وہ جانا نہیں چاہتا تھا، لیکن بے جی کا حکم تھا، اس لیے دل پر جبر کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''بے جی......! آپ بیٹھ جائیں۔''

نائلہ نے کرسی گھسیٹ کر بیڈ کے قریب کر دی بے جی بیٹھ گئیں تو اس نے بھی دوسری کرسی سنبھال لی۔ بے جی خاموشی سے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگیں اور نائلہ کبھی کن انکھیوں سے بے جی کی طرف دیکھتی اور کبھی اس کی نظریں رابعہ کے چہرے کا طواف کرنے لگتیں۔

اس کی لرزتی پلکیں دیکھ کر نائلہ نے بے جی کو متوجہ کیا۔

''میرا خیال ہے، اسے ہوش آ رہا ہے۔''

''ہوں......!'' کہہ کر بے جی بغور اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ اس کی پلکیں ذرا سی کھلیں اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد نظریں بے جی پر ٹھہر گئیں۔

''کیسی طبیعت ہے تمہاری......؟'' بے جی کے نرم لہجے پر اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور ہونٹ بھینچ کر چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

''ارے......! تم رونے لگیں۔'' بے جی اپنی جگہ سے اٹھیں اور اس کے پاس جا بیٹھیں پھر اس کے بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے بولیں۔

''رومت بیٹا......! مجھے بتاؤ تم کون ہو......؟'' وہ چپ چاپ روتی رہی۔

''تمہارا گھر کہاں ہے......؟'' کوئی جواب نہیں آیا تو وہ نائلہ سے کہنے لگیں۔

''جاؤ، دودھ اور اوولٹین ملا کر لے آؤ۔'' نائلہ فوراً چلی گئی اور کچھ دیر بعد ہی دودھ لے کر آ گئی۔

''اٹھو...... یہ پی لو۔'' بے جی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا لیکن اس نے دودھ پینے سے انکار کر دیا۔

''پی لو...... جلدی اچھی ہو جاؤ گی۔''

''مجھے اچھا نہیں ہونا۔'' وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بے جی نے اسے رونے دیا، بس بہت آہستگی سے اس کی کندھا تھپکتی رہیں۔ کافی دیر کے بعد وہ خود ہی چپ ہو گئی۔ تب انہوں نے دودھ کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ اب انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے خاموشی سے گلاس لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

''کیا نام ہے تمہارا......؟'' اس کے ہاتھ سے خالی گلاس لیتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

''رابعہ......!'' بے جی نے نام یوں دہرایا جیسے اسے پکار رہی ہوں۔

''جی......!'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''پورا نام بتاؤ۔''

''رابعہ حق نواز۔''

بے جی چونکیں تو اسے دیکھ کر ہی تھیں اور اب تو کسی شبہے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔

''تم مہر النساء کی بیٹی ہو ناں......؟'' انہوں نے پوچھا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی

بے جی نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

''تمہارے گھر اطلاع کرا دوں کہ تم......!''

''نہیں بیگم صاحبہ......! میں گھر نہیں جاؤں گی۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''پھر......؟''

''مجھے کہیں اور جانا ہے۔''

''کہاں......؟''

''خضر حیات صاحب کے گھر......'' وہ کچھ دیر رک کر پوچھنے لگی۔ ''آپ جانتی ہیں خضر حیات کو۔''

''ہاں......!'' بے جی ہلکے سے مسکرائیں۔

''پھر اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو مجھے ان کے گھر پہنچوا دیں۔'' وہ منت سے بولی۔

''تم خضر حیات ہی کے گھر میں ہو۔'' بے جی نے کہا تو وہ حیرت سے ان کی طرف دیکھتے

ہوئے بس اتنا کہہ سکی۔

''آپ......؟''

''ہاں میں صالحہ ہوں۔'' بے جی نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

اور وہ تو کب سے کسی مہربان کاندھے پر سر رکھنا چاہ رہی تھی بے اختیار روتی چلی گئی۔

''بس کرو بیٹا......! بہت رو چکیں۔'' اس کے سر اور کمر کو تھپکتے ہوئے بے جی نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا پھر کہنے لگیں۔

''ایک بات بتاؤ......! ابھی اتفاقاً تمہارے ساتھ حادثہ ہوا ہے یا تم خود جان بوجھ کر گاڑی کے سامنے آئی تھیں......؟''

''پتا نہیں بیگم صاحبہ......! میں شاید آپ کا گھر تلاش کرتے کرتے تھک گئی تھی، پھر بھی میرا خیال ہے، میرا خود سے گاڑی کے سامنے آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔''

''اچھا......!'' بے جی کھل کر مسکرائیں۔ ''اور یہ تم مجھے بیگم صاحبہ کیوں کہہ رہی ہو......؟''

وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم مجھے بے جی کہہ سکتی ہو، جیسا کہ میرے بچے کہتے ہیں۔'' پھر انہوں نے نائلہ کو بلایا اور وہ جو بہت دیر سے انتظار کر رہی تھی کہ کسی طرح بے جی اسے بھی اپنی باتوں میں شامل کریں۔ فوراً آگے بڑھ آئی۔

''نائلہ......! یہ رابعہ ہے۔'' بے جی تعارف کروانے کے بعد کہنے لگیں۔ ''شروع میں جب ہم پاکستان آئے تھے تو کچھ عرصہ ہم نے اس کی دادی کے گھر قیام کیا تھا اور وہیں ہماری شادی ہوئی تھی۔ بہت نیک خاتون تھیں اس کی دادی بے چاری کے نصیب میں شاید سکھ نہیں تھا۔ ایک ہی بیٹا اور وہ بھی۔'' بے جی خاموش ہو گئیں پھر کچھ دیر کے بعد پوچھنے لگیں۔

''اب کیسے ہیں تمہارے والد......؟''

''ویسے ہی ہیں۔''

''اور ہاں تمہیں میرے پاس کس نے بھیجا......؟''

''ابا نے......''

اس کے مختصر جواب پر بے جی اس کی طرف یوں دیکھنے لگیں، جیسے پوچھنا چاہتی ہوں، کس کام سے۔

وہ ان کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر سوچنے لگی کہ انہیں کیسے بتائے کہ وہ کن حالات سے گزر کر یہاں تک آئی ہے اور یہ کہ اس کے حالات سن کر پتا نہیں، بے جی اس کی کوئی مدد کر بھی سکیں گی یا

نہیں۔ اسے سوچتے دیکھ کر بے جی جانے کیا سمجھیں۔ نائلہ سے کہنے لگیں۔

''نائلہ......! تم ذرا صبیحہ کے کمرے میں چلی جاؤ۔'' نائلہ بھی شاید یہی سمجھی کہ وہ اس کی موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتی اس لیے چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی۔

''ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے......؟''

بے جی اتنے اعتماد سے بولیں جیسے انہیں یقین ہو کہ اب وہ کوئی بات نہیں چھپائے گی اور ان کا یقین غلط نہیں تھا۔ اس نے آنسوؤں کے درمیان اپنی ساری بپتا کہہ سنائی۔

بے جی ایک ماں بھی تھیں، حساس دل بھی رکھتی تھیں۔ بظاہر ہر بات سکون سے سنتی رہیں لیکن دل جیسے خون کے آنسو رونے لگا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو کتنی دیر تک بے جی تسلی کا ایک لفظ تک نہ کہہ سکیں۔

''کیا آپ میری کوئی مدد کریں گی......؟'' وہ یہ بات پوچھ رہی تھی جس کی دادی کے احسان کا بوجھ بے جی اب تک اپنے کندھوں پر اٹھائے پھر رہی تھیں۔ اور پھر مہرالنساء نے کہا تھا۔

''اگر آپ اماں کے احسان کا بدلہ اتارنا ہی چاہتی ہیں تو ان بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیجئے کہ یہ انہیں کی اولاد ہیں۔''

''بے جی......!'' انہیں سوچتے دیکھ کر اس نے ڈرتے ڈرتے پکارا تو بے جی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

اس کی آنکھوں میں آس و نراس کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں اور شاید اندر کے خوف کا ہلکا سا عکس بھی چہرے پر جھلک رہا تھا کہ اگر بے جی نے پناہ نہ دی تو وہ کہاں جائے گی۔

''بیٹا......!'' بے جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''میں تو بہت پہلے تمہیں اپنے ساتھ لانا چاہتی تھی لیکن تمہاری اماں نے آنے نہیں دیا اور اب جب تم آ ہی گئی ہو تو اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

''اس وقت رات زیادہ ہو گئی ہے، صبح میں خود تمہارے والد کے پاس جاؤں گی۔''

''آپ......!'' وہ پتا نہیں کیا پوچھنا چاہتی تھی۔

''ہاں میں......'' اس کے ساتھ ہی بے جی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''اب تم آرام سے لیٹو، دل پر کسی قسم کا بوجھ مت ڈالو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نائلہ کو تمہارے پاس بھیج دیتی ہوں۔''

بے جی اسے تسلی دیتی ہوئی کمرے سے نکل آئیں۔ برآمدے میں حسام اور نائلہ سر جوڑے بیٹھے تھے۔ یقیناً ان کا موضوع رابعہ تھی۔ بے جی کو دیکھ کر دونوں فوراً سیدھے ہو گئے۔

''تم ابھی تک سوئے نہیں......؟'' وہ حسام سے پوچھنے لگیں۔ ''بس ابھی جا ہی رہا تھا۔''

"چلو جاؤ۔" بے جی نے اپنے سامنے اسے کمرے میں بھیجا پھر نائلہ سے کہنے لگیں۔
"رابعہ......! تمہارے ہی کمرے میں سوئے گی، اس کا خیال رکھنا۔"
"جی......!" نائلہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تو بے جی اسے کچھ ہدایات دے کر اپنے کمرے میں چلی آئیں۔

خضر حیات صوفے پر بیٹھے کچھ کاغذات دیکھنے میں مصروف تھے۔ آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

بے جی انہیں رابعہ کے بارے میں بتانا چاہتی تھیں، اس لیے ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگیں۔



صبح سب معمول کے مطابق اٹھے اور پھر ناشتے کی ٹیبل پر بے جی نے سب کو چونکا دیا۔
"میں نے حسام کی شادی طے کر دی ہے، اسی جمعہ بارات جائے گی۔"
جس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا اور سب سوالیہ نظروں سے بے جی کی طرف دیکھنے لگے۔ ہونٹ ہلانے کی جرات کسی میں نہیں تھی۔ خضر حیات اپنی اولاد کو گم صم دیکھ کر خاصے محظوظ ہوئے اور ان کے ہونٹوں کی دبی دبی مسکراہٹ سے حوصلہ پا کر احتشام کہنے لگے۔
"بے جی......! یہ بیٹھے بٹھائے حسام کی شادی کا کیسے سوچ لیا آپ نے اور وہ بھی یوں آناً فاناً......؟"

"مجھے ایک لڑکی اچانک پسند آ گئی اور وہ جس طرح اچانک پسند آئی، اسی طرح میں نے اچانک حسام کی بات بھی طے کر دی۔"

"بات طے کر دی، یہ تو اچھی بات ہے لیکن فوری شادی والا معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ ابھی حسام کی تعلیم۔"

خضر حیات بات ادھوری چھوڑ کر بے جی کی طرف دیکھنے لگے کیونکہ رات انہوں نے رابعہ کے بارے میں بتایا تو تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کی حسام سے شادی بھی کرنا چاہتی ہیں۔
"تعلیم بھی مکمل ہو جائے گی۔" بے جی فوراً بولیں۔ "ہاں اگر آپ کو میرے اس فیصلے سے اختلاف ہو تو بتا دیجیے۔"

"اختلاف......" خضر مسکرائے۔ "اختلاف ہی تو نہیں ہے آپ بہتر سوچ سکتی ہیں۔"
"بے جی......! اگر مناسب سمجھیں تو ہمیں بھی بتائیں حسام کی شادی کہاں کر رہی

ہیں......؟"
"اس لڑکی کا نام رابعہ ہے، رابعہ حق نواز۔"
"ارے......!" وہ حیران ہوا۔
وہ رات بھر اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا، لیکن اس رخ پر تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے سینے میں خوشگوار دھڑکنوں کا ارتعاش پیدا ہو گیا۔ منزل اتنی قریب آ گئی تھی کہ وہ ہاتھ بڑھا کر چھو سکتا تھا۔ کل تک وہ کس قدر پریشان تھا، اس کے لیے اور اس کا حصول ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اور اب......

دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے اس نے نظروں کا زاویہ بدل کر دیکھا۔ بے جی اور بابا دونوں اٹھ کر جا رہے تھے، پھر ان کے جاتے ہی کمرے کی خاموش فضا میں ایک دم ہلچل مچ گئی۔
"کمال کر دیا بے جی نے۔ مجھے واقعی بہت خوشی ہو رہی ہے۔" نائلہ بے پناہ خوشی کا اظہار کرنے لگی۔ وہ رات بھر میں اس کے تمام حالات اسی کی زبانی سن چکی تھی اور اسے اس پیاری سی لڑکی رابعہ سے ہمدردی کے ساتھ ساتھ اپنائیت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔
"خوشی کی بات تو ہے لیکن اچانک سب کیسے ہو گیا......؟" صائمہ بھابی پوچھنے لگیں۔
"قصہ کچھ یوں ہے۔" نائلہ نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا پھر رات کا سارا واقعہ کہہ سنایا لیکن رابعہ کے بارے میں صرف اتنا بتایا کہ وہ بے جی کی کسی عزیز مرحومہ دوست کی بیٹی ہے اور اتفاقاً حسام سے ٹکرا کر اس گھر تک آ پہنچی ہے۔ اس نے رابعہ کے حالات یوں نہیں بتائے کہ...... بے جی نے صبح ہی اس کے کمرے میں آ کر اسے منع کر دیا تھا۔
"کیا وہ اب بھی تمہارے کمرے میں موجود ہے۔" صبیحہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔
"ہاں......!"
"میں ابھی دیکھ کر آتی ہوں۔" صبیحہ بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھی تو نائلہ نے اسے روک دیا۔
"ابھی مت جاؤ۔ میرا خیال ہے، بے جی اور بابا دونوں اسی کے پاس بیٹھے ہوں گے۔ خواہ مخواہ ڈانٹ پڑ جائے گی۔"
"یہ تو ہے۔" صبیحہ دوبارہ بیٹھ گئی۔ "ویسے رات میں ہم کہاں تھے......؟"
"تم سب اپنے اپنے کمروں میں تھے اور تھی تو میں بھی اپنے کمرے میں لیکن اتفاق سے بے جی اسے میرے کمرے میں لے آئیں۔"
"کیسی ہے......؟" صبیحہ کا اشتیاق کم نہیں ہو رہا تھا۔

"بہت پیاری ہے، ویسے حسام سے پوچھو۔" اور وہ جو جانے کن سوچوں میں گم تھا، اپنے نام پر چونک کر سب کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"ہاں بھئی...... تم کہو۔" احتشام بھائی کے مسکرانے پر وہ جھینپ کر سر کھجانے لگا۔

"بے چارا برا پھنسا۔" صائمہ بھابی تاسف کا اظہار کرنے لگیں۔ اصل میں انہیں یہ سارا قصہ پسند ہی نہیں آیا تھا۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اس گھر میں اپنی بہن کو لانا چاہتی تھیں اور دوسری، بہت عام سی لڑکی ان کے برابر درجہ حاصل کرنے آ رہی تھی۔

"برا نہیں، اچھا پھنسا۔" نائلہ فوراً بولی۔ "آپ رابعہ کو دیکھیں گی تو میری بات کی تائید کریں گی۔"

"مجھ سے اب صبر نہیں ہو رہا، چلیں نائلہ باجی! میں اسے دیکھوں گی۔"

صبیحہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آیئے صائمہ بھابی! آپ بھی چلیں۔"

"چلو......!" صائمہ بھابی اُٹھیں تو نائلہ کو بھی اُٹھنا پڑا، لیکن تینوں جیسے ہی ڈرائنگ روم سے نکلیں انہوں نے بے جی، بابا اور ان کے ساتھ رابعہ کو برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گاڑی کی طرف جاتے دیکھا۔

"یہ سب کہاں جا رہے ہیں......؟" نائلہ نے کہا۔ صائمہ بھابی نے کندھے اچکائے جبکہ صبیحہ اچک اچک کر رابعہ کو دیکھنے کی کوشش کرتی رہی اور اپنی کوشش میں ناکام ہو کر وہ منہ پھلائے ہوئے دوبارہ کمرے میں آ گئی۔

"ارے تمہیں کیا ہوا......؟" احتشام بھائی اس کے پھولے پھولے چہرے کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"بے جی اگر ہمیں دکھا دیتیں تو کیا ہوتا۔"

"کیا انہوں نے ڈانٹ دیا......؟"

"نہیں......"

"پھر......؟"

"وہ اور بابا، رابعہ کو لے کر چلے گئے ہیں۔"

"کہاں......؟" حسام چونک کر پوچھنے لگا۔

"پتا نہیں...... ہم نے بس انہیں جاتے دیکھا ہے۔"

وہ تو خفگی سے کہہ کر اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے پیچھے احتشام بھائی بھی چلے گئے جبکہ وہ کتنی دیر تک وہیں بیٹھا سوچتا اور الجھتا رہا تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اٹھ کر نائلہ کے کمرے کی طرف

چل پڑا۔

نائلہ اسے دیکھ کر سمجھ گئی کہ وہ رابعہ کے بارے میں جاننے آیا ہے پھر بھی انجان بن گئی۔

"تم آج کالج نہیں جاؤ گے......؟" سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

"اور تم......!"

"جاؤں گی لیکن ذرا دیر سے......"

"میں آج چھٹی کروں گی۔"

"اچھا......!" وہ اطمینان سے بیڈ پر ٹانگیں سیدھی کر کے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر بظاہر لاپرواہی سے پوچھنے لگا۔

"یہ بے جی کہاں گئی ہیں......؟"

"صرف بے جی تو نہیں۔" وہ اس کے انداز پر شرارت سے ہنس پڑی۔

"جب جان ہی گئی ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں تو بتا دو۔"

"کیا بتاؤں......؟"

"یہی کہ کون ہے اور کیا واقعی وہ بے جی کی کسی دوست کی بیٹی ہے......؟"

"ہاں......! وہ بے جی کی دوست کی بیٹی ہے۔"

"اور وہ رات کے وقت اکیلی کہاں جا رہی تھی، جو میری گاڑی سے آ ٹکرائی۔"

"وہ ہمارے ہی گھر آ رہی تھی۔"

"کیا......؟" وہ متعجب ہوا پھر جھنجلا کر کہنے لگا۔ "اصل بات بتاؤ کیا ہے......؟"

"اصل میں اس کے حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں اور بے جی نے مجھے منع کیا ہے کہ کسی سے ذکر نہ کروں۔"

"کیوں......؟"

"کیونکہ وہ اس کے ساتھ تمہاری شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی ہیں اور شاید ان کے پیش نظر یہ بات ہے کہ ہو سکتا ہے اس کے حالات جان کر تم ان کے فیصلے سے اختلاف کرو۔"

"میں کیسے اختلاف کر سکتا ہوں جبکہ میں خود بہت پہلے ہی اس سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور نائلہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"بہت پہلے سے کیا مطلب......؟ کب سے جانتے ہو رابعہ کو......؟"

"میں...... میں کہاں جانتا ہوں اسے......؟" وہ بوکھلا گیا۔

"ٹھیک ہے پھر میں بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔"

"مت بتاؤ۔ ایک ہفتے کی تو بات ہے، شادی ہو جائے گی تو میں خود ہی اس سے پوچھ لوں

گا۔'' وہ اپنی بات پر خود ہی محظوظ ہو کر ہنسنے لگا۔

''میں تمہاری شادی ہونے دوں گی تب ناں......''

''کیا مطلب......؟''

''بے جی سے کہہ دوں گی کہ تمہیں رابعہ پسند نہیں آئی اور تم کسی قیمت پر اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے اور یہ بھی کہ تم اپنی کسی کلاس فیلو کو پسند کرتے ہو۔''

وہ اتنی سنجیدگی سے بولی کہ وہ ایک ہی جست میں بیڈ سے اچھل کر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

''خبردار......! تم نے ایسی کوئی بات کی۔''

''تو پھر سیدھی طرح بتاؤ۔'' اسے ہتھیار ڈالنے پڑے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ بھی اس کے بارے میں بتائے گی۔

○ ○ ○

نادر، اماں کے پاس سے اُٹھ کر کچن میں آیا، وہ رابعہ سے کھانے کا کہنے آیا تھا لیکن وہ کچن میں موجود نہیں تھی۔ وہ الٹے پاؤں اس کے اسٹور نما کمرے میں گیا اور وہاں نہ پا کر وہیں سے اونچی آواز میں پوچھتا ہوا آیا۔

''یہ رابعہ کہاں چلی گئی، کھانا نہیں دے گی کیا......اماں......! رابعہ کہاں ہے......؟''

''وہیں اندر ہی کہیں مری ہوگی۔'' اماں نے وہیں سے جواب دیا۔

''یہاں تو نہیں ہے۔'' اس نے کہا اور نظریں اس کونے میں جا بھٹکیں، جہاں ابا آرام سے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ وہ ان کے پاس چلا آیا۔

''رابعہ کہاں ہے......؟''

''پتا نہیں، ابھی تو مجھے کھانا دے کر گئی ہے۔'' ابا نے اپنا لاتعلقی کا انداز اپنائے رکھا۔

''کہاں جائے گی، اندر ہی ہوگی۔''

''اندر نہیں ہے۔''

''پھر مجھے نہیں پتا۔'' ابا نے قمیص کے دامن سے ہاتھ صاف کیے اور خالی برتن اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے۔ ''لو یہ لیتے جاؤ۔''

''کیا......؟'' وہ چیخا اور برتنوں کو اتنی زور سے ہاتھ مارا کہ وہ آنگن میں جا گرے۔

''سیدھی طرح بتاؤ، رابعہ کہاں ہے......؟'' ابا کو اس کی بدتمیزی پر غصہ آ ہی چکا تھا اور غصے

میں انسان آپے میں نہیں رہتا۔

انہوں نے بھی نتیجے کی پرواہ کیے بغیر کہہ دیا۔

''رابعہ کو میں نے بھیج دیا ہے۔''

''کہاں......؟'' وہ اتنی زور سے چیخا کہ اماں گھبرا کر باہر نکل آئیں۔

''کیا ہوا نادر......! کیوں چلا رہا ہے......؟''

''اس سے پوچھو، کہہ رہا ہے میں نے رابعہ کو بھگا دیا ہے۔''

''کس کے ساتھ......؟'' اماں کے منہ سے بے اختیار نکلا، پھر وہ قریب آتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''کیا ہوا حق نواز......! کہاں بھیج دیا رابعہ کو......؟''

''وہ میری بیٹی ہے اور میں نے جہاں مناسب سمجھا ہے اسے بھیج دیا ہے۔ تم لوگوں کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ابا کی بات پوری ہوئی ہی تھی کہ اماں چیخ پڑیں۔

''اب وہ تمہاری بیٹی ہو گئی ہے اور جو میں نے پال پوس کر بڑا کیا تو میرا کوئی حق ہی نہیں رہا۔ کس دھڑلے سے کہہ رہے ہو کہ ہمیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ارے لوگ تو مجھ پر نام دھریں گے۔ سوتیلی ماں تھی نکال کر باہر کیا ہوگا۔ ہائے میں کس کس کو جواب دوں گی۔'' اماں نے منہ پر دوپٹہ رکھ کر رونا شروع کر دیا۔

حق نواز تو دوبارہ بے حسی کی چادر اوڑھ ہی چکے تھے۔ اس لیے ان پر اماں کے رونے کا کوئی اثر نہیں ہوا جبکہ نادر، ماں کو روتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''اماں......! رو مت۔ میں ابھی نکل کر دیکھتا ہوں زیادہ دُور نہیں گئی ہوگی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

پھر دو تین گھنٹے کی تلاش کے بعد جب وہ ناکام لوٹا تو اس کا غصہ تو انتہا کو پہنچ ہی چکا تھا۔ ناکامی نے اسے جنونی بھی بنا دیا تھا۔ بقیہ تمام رات نہ وہ خود سویا نہ ابا کو سونے دیا وقفے وقفے سے انہیں جھنجوڑ کر پوچھتا رہا۔ کہاں بھیج دیا اسے اور ابا کو بھی شاید ضد چڑھ گئی تھی بتا کے نہیں دیا۔

پھر جب ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اماں اور نادر سر جوڑ کر بیٹھے تو اسی وقت دروازے پر دستک ہونے لگی۔ وہ بادل نخواستہ اٹھ کر گیا اور دروازے پر رابعہ کو دیکھ کر وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نظر صالحہ بیگم اور خضر حیات پر پڑی۔ اس نے ہونٹ دانتوں میں دبا کر اپنی بات روکی اور دروازے سے ہٹ کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔

''حق نواز کہاں ہے......؟'' خضر حیات نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔ اور اس کے جواب دینے سے پہلے رابعہ انہیں لے کر ابا کی طرف بڑھ گئی۔

"ابا......! یہ آپ سے ملنے آئے ہیں۔" رابعہ نے ابا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں متوجہ کیا۔ ابا کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھے گئے پھر ان کی نظریں خضر حیات پر پڑیں۔

"آپ اسے یہاں کیوں لے آئے اگر آپ کے پاس جگہ نہیں تھی تو کہیں اور......"

"یہ بات نہیں ہے حق نواز......!" بے جی ان کی بات کاٹ کر کہنے لگیں۔ "میں تو بہت پہلے رابعہ کو لے جانا چاہتی تھی، لیکن...... خیر چھوڑو۔" انہوں نے گئے وقتوں کی بات وہیں چھوڑ دی پھر کہنے لگیں۔ "اب بھی میں اسے لے جانے کے لیے ہی آئی ہوں۔"

"ہم اسے بہو بنا کر لے جانا چاہتے ہیں اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو......"

اور حق نواز کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا بھلا، وہ احساس ممنونیت سے بے جی اور پھر خضر حیات کی طرف دیکھے گئے۔ جبکہ رابعہ، اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ بیگم صالحہ خضر حیات اس پر اتنی مہربان ہو جائیں گی کہ اسے اس طرح اپنے گھر لے جانے کی بات کرنے لگیں گی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اب وہ اس گھر سے فرار چاہتی تھی لیکن جس کی خاطر فرار کا سوچا تھا، وہ جانے کہاں تھا۔

"ہم اسی جمعہ کو بارات لے کر آئیں گے، تب تک رابعہ آپ کے پاس ہماری امانت ہے۔" بے جی کہہ رہی تھیں اور وہ چپ چاپ اٹھ کر اپنے اسٹور نما کمرے میں آ گئی پھر اس نے وہیں دروازے میں رک کر سنا۔ بے جی اس کی اماں اور نادر کو سمجھا رہی تھیں۔

"رابعہ اب ہماری امانت ہے اور ہم اس پر کسی قسم کی کوئی زیادتی برداشت نہیں کریں گے۔" بے جی جانے سے پہلے ایک طرح سے وارننگ دے گئی تھیں۔

اب جب وقت مہربان ہو رہا تھا تو اس کے اندر بے کلی بڑھتی جا رہی تھی پہلے شاید امید تھی کہ کبھی تو حسام اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں تک چلا آئے گا اور اب جبکہ بے جی اس کے جملہ حقوق اپنے بیٹے کے نام محفوظ کروا کے جا چکی تھیں تو اس کی آخری امید نے دم توڑ کر اسے بے کل کر دیا تھا۔

○ ○ ○

شام میں بے جی نے نائلہ، صبیحہ اور حسام کو بلا کر ایک طویل فہرست نائلہ کے ہاتھ میں تھما دی اور کہنے لگیں۔

"تم دونوں بہنیں حسام کے ساتھ چلی جاؤ۔"

"جی......!" نائلہ فہرست پر نظریں دوڑانے لگی۔

"ہر چیز اچھی اور دیکھ بھال کر لینا۔"

"بے جی......! اگر صائمہ بھابی بھی ساتھ چلیں تو......!"

"نہیں صائمہ آج کل باہر نکلنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور پھر وہ اس حالت میں تم لوگوں کے ساتھ کہاں ماری ماری پھرے گی۔ کوئی ایک چیز تو لینی نہیں ہے۔"

پھر حسام سے کہنے لگیں۔ "تم بہنوں کے ساتھ رہنا اور ذرا خیال رکھنا۔"

"جی......!" اس نے سعادت مندی سے سر جھکایا پھر بے جی سے لسٹ اور پیسے لے کر وہ تینوں باہر نکل آئے۔

"نائلہ......!" مین روڈ پر گاڑی لاتے ہی وہ کہنے لگا۔ "رابعہ کا کچھ اتا پتا......؟"

"ہاں......! دوپہر میں، میں نے بے جی سے خاصی معلومات حاصل کی ہیں۔"

"پھر کیا خیال ہے، اسے بھی لے چلیں......؟"

"بھائی! ہوش میں تو ہو، بے جی کو پتا چل گیا تو......"

"کون بتائے گا انہیں، ہم تینوں تو ہرگز نہیں بتائیں گے۔"

"ہو سکتا ہے، اس کے گھر والے۔" نائلہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

"کچھ نہیں ہوتا آپی......! لے چلتے ہیں اسے بھی۔" صبیحہ نے بھائی کی طرف داری کی۔ اصل میں اس کا اپنا بہت دل چاہ رہا تھا کہ رابعہ کو دیکھے۔

"میں یہیں اتر جاتا ہوں۔ تم اسے لے کر آ جاؤ۔" اس نے فوراً تجویز پیش کی۔

"اتنی بھی بے صبری کیا ہے، تین چار دن کی تو بات ہے، پھر وہ آ ہی جائے گی۔" نائلہ کو بے جی کا زیادہ ڈر تھا۔

"میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھ تو چکے ہو۔"

"کہاں...... بے جی کی موجودگی میں ہمت ہی نہیں ہوئی۔"

"کیا......؟ بے جی کی موجودگی میں اور جو پہلے......؟" نائلہ اس کا پول کھولنے جا رہی تھی کہ اسے گھورتے دیکھ کر چپ ہو گئی۔

"میں نے تو نہیں دیکھا۔" اس نے گاڑی روک دی اور فوراً دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

"تم اسے کسی بھی بہانے لے آؤ، میں یہیں ملوں گا۔" نائلہ مجبوراً ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھی پھر اسے ہاتھ ہلاتی ہوئی گاڑی آگے بڑھا لے گئی اور وہ وہیں کھڑا رہ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد اسے اپنی گاڑی آتی ہوئی نظر آئی تو وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا اور اس انداز سے جیسے اتفاقاً یونہی سر راہ کھڑا ہو۔

"ارے حسام بھائی......! آپ یہاں کہاں کھڑے ہیں۔" نائلہ نے گاڑی اس کے قریب

زکی اور صبیحہ شیشے سے سر باہر نکال کر یوں پوچھنے لگی، جیسے اس نے بھی اتفاقاً اسے دیکھ لیا ہو اور وہ جو اپنے خیال میں بیٹھی تھی، اس کے نام پر چونک کر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جسے وہ پورا دن سوچتے ہوئے ہلکان ہوتی رہی ہے وہ یوں اپنا سا بن کر سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔

"یہ لڑکی کون ہے......؟" اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ شرارت سے مسکرایا۔

"تم ہم سے زیادہ جانتے ہو گے۔" نائلہ ہنسی۔

"نہیں بالکل نہیں جانتا۔" اس نے نائلہ کو پیچھے بھیج کر خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور وہ اس کی قربت سے نروس ہو کر چادر کو آگے تک کھینچ کر اپنے تئیں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی جبکہ اب وہ اسے مرر میں دیکھ رہا تھا۔

پھر خریداری کے دوران وہ ہر چیز میں اس کی پسند پوچھتا رہا اور وہ حیرتوں کے سمندر سے نکلتی تو کچھ کہتی۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وقت اس پر یوں بھی مہربان ہو جائے گا۔

"دیکھو......! بعد میں مت کہنا کہ مجھے یہ سب پسند نہیں۔ اسی وقت مجھ سمیت ہر چیز کو اچھی طرح دیکھ لو۔" وہ اس کی مسلسل خاموشی پر کہنے لگا تو نائلہ ہنس پڑی پھر کہنے لگی۔

"میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں، اسے ہر چیز پسند آئے گی سوائے تمہارے۔"

"کیا......؟" وہ قدم روک کر کھڑا ہو گیا۔

"رکو مت، چلتے رہو۔"

"نہیں...... یہیں فیصلہ ہو جائے۔" وہ اڑ گیا اور اس کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"بتاؤ......! میں کیسا ہوں......" وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے نائلہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیوں تنگ کرتے ہو بے چاری کو۔" نائلہ نے اسے دھکا دے کر ہٹایا اور رابعہ کا ہاتھ پکڑ کر آگے چل پڑی۔

واپسی میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ وہ راستے میں اتر گیا۔ پہلے نائلہ اسے گھر چھوڑ کر آئی اور پھر تینوں ساتھ اپنے گھر آ گئے۔

وہ بے حد مطمئن تھا اور خوش بھی اور سوچ رہا تھا کہ اس کی سنگت میں باقی ماندہ حیات کا سفر خوبصورتی سے طے ہو گا۔

○○○

چوتھے دن وہ اپنے وجود کی تمام تر رعنائیوں اور خوبصورتیوں سمیت اس کے کمرے میں موجود تھی۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا اور جہاں وہ یہ سوچ رہا تھا کہ چار دن پہلے تک اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ زندگی میں یہ خوبصورت موڑ اچانک در آئے گا۔ وہاں وہ بھی حیران تھی اور شاید اپنے آپ کو یہ یقین دلانے میں ناکام ہو رہی تھی کہ وہ عذاب زندگی سے نکل کر گلاب زندگی میں قدم رکھ رہی ہے۔

"رابعہ......!" اس نے پکارا اور اس کے قریب جا بیٹھا۔ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں اور نہ ہی اس کے ہونٹوں پر شرمگیں مسکراہٹ مچلی۔ اس کے برعکس خوف کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں اس کے چہرے پر پھیلنے لگیں جنہیں محسوس کر کے اس نے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

"کیا بات ہے، تم خوفزدہ ہو......؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔ تو اس نے ایمانداری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیوں......؟" اور اس کیوں کے جواب میں رو پڑی یہاں اس نے بے جی والا حربہ استعمال کیا۔ اسے رونے دیا۔ جب وہ خود ہی چپ ہو گئی تب کہنے لگا۔

"اب بتاؤ کیا بات ہے......؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"مجھ سے......!" وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

"نہیں...... اپنے مقدر سے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ "مجھے خوشیاں راس نہیں آتیں۔ میں نے جب کبھی کسی چھوٹی سی خوشی کا تصور بھی کیا تو......"

"رابعہ......!" اس نے ٹوک دیا۔ "اب تمہیں میری ہمراہی میں ڈرنا نہیں چاہیے اور سنو......! میری ہمنوا......! تمہارے مقدر سے میں لڑوں گا اور اس سے چھوٹی چھوٹی نہیں بڑی بڑی خوشیاں چھین کر تمہارا دامن بھروں گا۔"

وہ بھیگی بھیگی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"جو زندگی گزر گئی اچھی یا بری، اسے بھول جاؤ۔ اب صرف یہاں دیکھو، یہاں کے ہر فرد کو تم اپنے آپ سے محبت کرتا پاؤ گی۔" پھر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہنے لگا۔

"اور میں صرف جان دینے کی باتیں ہی نہیں کروں گا کبھی وقت آنے پر تم پر جان دے بھی دوں گا۔"

اس کی آنکھوں میں پھر نمی اترنے لگی۔

"اوں ہوں......! اب مت رونا۔" وہ فوراً پلکیں جھپکنے لگی تو وہ ہنس پڑا۔

''گڈ......! اب ذرا ہنس کر بھی دکھا دو، تاکہ میں سمجھوں کہ تم یہ کام بھی بخوبی کر سکتی ہو۔''
بات کے اختتام پر اس نے اپنی ایک آنکھ بند کر لی اور وہ جو پوری آنکھیں کھولے اسے ہی دیکھ رہی تھی اس کی اس حرکت پر بری طرح جھینپ گئی۔

رات اس نے صرف اس کی محبتیں دیکھی تھیں اور انہی کے لیے اسے اپنا دامن تنگ لگ رہا تھا اور صبح اتنی ڈھیر ساری محبتیں ایک ساتھ اس کی جھولی میں آن گریں۔

بابا، بے جی اور احتشام بھائی کی پر شفقت چاہتیں۔ بظاہر صائمہ بھابی بھی خوش تھیں اور پھر نائلہ، انعام اور صبیحہ کی پر خلوص محبت۔ وہ ایک ایک کی محبت اپنے دل کے نہاں خانوں میں سنبھالتی گئی۔ کبھی جو وقت پہلو بدلے۔ (وہ اس وہم سے نکلی نہیں تھی) تو وہ ان محبتوں کو آواز دے لے گی۔

ولیمے کے بعد بے جی نے اس نئے جوڑے کے تمام پروگرام کینسل کروا دیے۔ یعنی ہنی مون اور ملنے ملانے والوں کے ہاں دعوتیں۔ سب کو بڑی سہولت سے منع کر دیا کیونکہ حسام کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا۔

''میں امتحانوں کے بعد ساری کسر نکال دوں گا۔'' وہ اس سے کہنے لگا۔

''میرے لیے یہی گھر جنت سے کم نہیں اور مجھے اس سے دور جانے کی آرزو بھی نہیں ہے۔ آپ خواہ مخواہ دل میلا مت کریں۔'' وہ پوری سچائی اور ایمانداری سے بولی تھی۔

ان کی شادی کو ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ صائمہ بھابی نے ایک پیارے سے بیٹے کو جنم دیا۔ ایک عرصے بعد اس گھر میں بچے کی آمد ہوئی تھی۔ سب بے طرح خوش تھے اور بے جی کی خوشیوں کا تو ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ بچے کے ساتھ ساتھ صائمہ بھابی کے بھی وہ ناز اٹھائے کہ کسی کسی وقت تو صائمہ بھابی کو خود اپنے آپ پر رشک آنے لگتا تھا۔ چھٹی، چھلہ، سب بہت دھوم دھام سے کیا تھا۔

وہ جو ایک عمر زندگی کی تپتی دھوپ میں سفر کرنے کے بعد ٹھنڈی اور پرسکون چھاؤں میں آئی تھی، گو کہ بہت خوش تھی کہ اسے اس کی حیثیت اور سوچ سے بڑھ کر ملا تھا لیکن ایک وہم جو ہمیشہ اس کے دل میں جاگزیں رہا کہ اسے خوشیاں راس نہیں آتیں، وہ اب بھی اپنی جگہ جوں کا توں موجود تھا۔

کہیں مجھ سے یہ سب چھن نہ جائے، یہ سب دھوکا نہ ہو، وقت نہ پہلو بدل جائے۔

یہ سب باتیں اسے پریشان کر دیتیں اور اس خیال سے کہ کہیں کسی کی محبت میں فرق نہ آ جائے، اس نے اپنے آپ کو سب کے لیے وقف کر دیا، سب کی چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ضرورتوں کا یوں خیال رکھتی جیسے یہ خاص اس کی ذمہ داری ہو۔

صبح جب حسام کالج جانے کے لیے تیار ہوتا تو وہ اس کی تیاری میں یوں مدد کرتی جیسے وہ کوئی

چھوٹا سا بچہ ہو، کئی بار اس نے جھنجلا کر اس کے ہاتھوں سے اپنے جوتے چھینے تھے۔

''تم کیوں اُٹھاتی ہو انہیں......؟''

''تو کیا ہوا......؟'' وہ سادگی سے بولی۔

''مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''رابی......! میری جان......! تمہارے یہ ہاتھ جوتے اُٹھانے کے لیے نہیں ہیں۔'' اتنی محبت اور یہ شہد آگیں لہجہ۔ وہ ڈرنے لگتی، وقت کا کوئی ظالم پنجہ ان لمحوں کو دبوچ نہ لے۔

سب کالج چلے جاتے تو وہ پہلے بے جی اور ان کے بعد صائمہ بھابی میں لگ جاتی، ان کے بچے رضا کے تیل کی مالش کرنا پھر منہ ہاتھ دھلا کر کپڑے بدلوانا، صائمہ بھابی حیرت سے پوچھتیں۔

''تم کیسے یہ سب کر لیتی ہو رابعہ! مجھے تو اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔''

''ارے......!'' وہ ہنستی پھر انہیں بتاتی کہ وہ چھوٹے بہن بھائیوں کو پال کر خاصی ایکسپرٹ ہو چکی ہے۔

پھر ننھے رضا سے فارغ ہونے کے بعد وہ کچن کا رُخ کرتی، گو کہ خانساماں موجود تھا پھر بھی وہ خود کھانا پکانے میں ہاتھ بٹاتی، کبھی صرف اس کی مدد کرتی اور کبھی الگ سے کوئی چیز بنا لیتی تھی، بے جی کو اس کا سلیقہ اور گھر داری میں دلچسپی پسند تھی، وہ اسے سراہتیں اور نائلہ صبیحہ کو اس کی مثال دیتی تھیں۔

''بھابی......! آپ تھکتی نہیں......؟'' نائلہ، صبیحہ اسے گھیر لیتیں۔

''تھکنا کیسا......؟'' وہ مسکراتی۔

''ذرا ذرا سے کام کے لیے خود اٹھ جاتی ہیں آخر یہ ملازم کس لیے ہیں۔''

''مجھے عادت ہے خود کام کرنے کی۔''

''ٹھیک ہے لیکن کم از کم آپ ہمارے لیے تو نہ اٹھا کریں ہمیں بہت شرمندگی ہوتی ہے۔''

وہ سوچتی۔

''میں نے تو ایک عمر اس گھر کی خدمت میں گزاری ہے جس کے مکینوں نے کبھی مجھے اپنا سمجھا ہی نہیں اور جنہوں نے محبت تو کیا ہمدردی کا ایک بول کبھی نہیں بولا، اور یہاں جو محبتوں کا بہتا ساگر ہے جس سے میری روح تک سیراب ہوئی جاتی ہے تو کیا اس کے لیے میں اتنا بھی نہیں کر سکتی۔''

پھر وقت کو جیسے پر لگ گئے تھے حسام کے امتحان شروع ہو گئے اور امتحان وہ دے رہا تھا پریشان وہ تھی۔ رات بہت دیر تک جب تک وہ اسٹڈی کرتا رہتا، وہ اس کے پیچھے چپ چاپ بیٹھی

رہتی اور جب محسوس کرتی کہ وہ جھنکنے لگا ہے تو اس کے لیے چائے بنا کر لے آتی۔

''تم سوئیں نہیں......؟'' وہ حیرت سے پوچھتا۔

''نیند نہیں آ رہی۔'' جب کہ آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی تھیں۔

''جاؤ سو جاؤ۔''

''ابھی نہیں جب آپ فارغ ہو جائیں گے تب۔''

''اور اگر میں رات بھر اسی طرح بیٹھا رہا تو......؟''

''میں بھی بیٹھی رہوں گی۔''

''بے وقوف......! چلو جا کر لیٹو۔'' وہ نہیں نہیں کرتی اور وہ زبردستی اسے بستر میں دھکیل دیتا۔

جس روز وہ آخری پیپر دے کر آیا برآمدے میں کھڑے ہو کر اونچی آواز میں ''میں فارغ ہو گیا'' کے نعرے لگانے لگا۔

''حسام......!'' بے جی نے آ کر اسے ٹوکا ''تم اب بچے نہیں ہو۔''

''ارے بے جی......! اتنے دنوں سے ٹینشن میں تھا آج ریلیکس ہوا ہوں تو خوب شور مچانے کو دل چاہ رہا ہے۔''

''اپنے کمرے میں جاؤ حسام......!'' بے جی کا ٹھہرا ہوا لہجہ۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ بچگانہ حرکتیں پسند نہیں کریں گی سر جھکا کر اپنے کمرے میں آ گیا وہ ایک سوٹ کیس میں کپڑے رکھنے میں مصروف تھی۔

''کہیں جا رہی ہو......؟ اس کے پوچھنے پر وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی جس طرح وہ حیران کھڑا تھا۔ اس سے وہ اسے ستانے پر آمادہ ہوئی، سنجیدگی کا لبادہ اوڑھتے ہوئے بولی۔

''ہاں......!''

''کہاں......؟''

''کہیں بھی۔''

''کہیں بھی......'' اس نے دُہرایا پھر الجھ کر پوچھنے لگا ''کیا مطلب ہے تمہارا......؟''

''آپ کی مصروفیت نے مجھے بور کر دیا ہے۔''

''لیکن اب تو میں فارغ ہو گیا ہوں۔'' وہ فوراً بولا۔

''تو پھر آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔''

''لیکن کہاں......؟''

''یہاں......'' اس نے ٹکٹ اٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے جنہیں وہ بے تابی سے دیکھنے لگا۔

''یہ کس نے دیں......؟''

''بے جی نے۔''

''ارے......!'' وہ بے طرح خوش ہوا۔ ''بے جی زندہ باد، کتنا خیال ہے انہیں ہمارا......''

پھر ٹکٹ رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''اور تم کیا کہہ رہی تھیں......؟''

''کچھ نہیں......''

''میری مصروفیت نے تمہیں بور کر دیا ہے۔'' وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ارادے خطرناک تھے اور بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔

○ ○ ○

مری، سوات، کاغان ان سرسبز وادیوں میں اس کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے وہ سارے اندیشوں کو پیچھے چھوڑ آئی اور قدرت جیسے اسے فیاضی سے نواز رہی تھی، وہ ابھی ان مسرتوں کو سنبھال نہیں پا رہی تھی کہ ایک اور خوشی اس کی جھولی میں آن گری۔

اس روز دوپہر کے کھانے کے بعد وہ دونوں ہوٹل سے نکل کر یونہی ٹہلتے ہوئے کافی آگے تک چلے گئے جب اچانک وہ چلتے چلتے رُکی اور سر جھٹکتے ہوئے پلکیں جھپک جھپک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''کیا ہوا رابعہ......!'' اسے کندھوں سے تھام کر وہ پریشانی سے پوچھنے لگا۔

''پتا نہیں میں بہت عجیب سا محسوس کر رہی ہوں۔'' پھر دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے بولی۔ ''مجھے چکر سے آ رہے ہیں۔''

وہ فوراً اس کی آنکھوں کے پپوٹے اونچے کر کے دیکھنے لگا پھر نبض پر ہاتھ رکھا تو کچھ شبہ ہوا تو ٹیکسی روک کر اسی وقت اسے قریبی کلینک لے گیا جہاں اس کے شبے کی تصدیق ہو گئی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

''رابعہ......! رابعہ......! رابعہ......!'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خوشی کا اظہار کس طرح کرے، بس اسے پکارے چلا گیا اور اس نے ہنستے ہوئے چادر میں منہ چھپا لیا۔

وہ خود ڈاکٹر تھا، جانتا تھا کہ اب ان اونچے نیچے راستوں پر چلنا اس کے لیے نقصان دہ ہو گا

اور یہ کہ اس وقت اسے آرام کی ضرورت ہے اور مکمل آرام اسے گھر پر ہی میسر آ سکتا تھا۔ لہٰذا ٹور پروگرام کینسل کرتے ہوئے وہ اسے لے کر واپس آ گیا۔

''ہیں تم تو دو مہینے کا کہہ کر گئے تھے اتنی جلدی واپس کیسے آ گئے۔'' بے جی کو اچنبھا ہوا۔

''اصل میں بے جی......! رابعہ کی طبیعت......'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکرایا تو وہ جھینپ کر اندر چلی گئی کچھ دیر بعد بے جی اس کے پیچھے پیچھے آئیں شاید حسام نے انہیں بتا دیا تھا اس لیے ان کی ہدایات شروع ہو گئیں۔

''اب زیادہ بھاگ دوڑ مت کرنا، جتنا ہو سکے آرام کرو، کوئی بھاری چیز مت اٹھانا اور اگر ایسی ہی کوئی ضرورت ہو تو مجھے بلا لینا، کھانا وقت سے کھاؤ اور کوئی خاص چیز کھانے کو دل چاہے تو۔'' وہ خاموشی سے سنتی اور سر ہلاتی گئی۔

پھر جس نے سنا خوشی کا اظہار کیا، نائلہ اور صبیحہ خاص طور پر اس کی دلجوئی کرتیں اور فارغ وقت میں اس کے پاس آ بیٹھتی تھیں۔ حسام کا ہاؤس جاب شروع ہو چکا تھا، اس کے باوجود وہ اسے زیادہ سے زیادہ وقت دینے کی کوشش کرتا تھا۔

''اتنی توجہ اتنی محبتیں......'' وہ پھر ڈرنے لگی، وقت کا کوئی ظالم پنجہ۔ ''میرے خدا......! تو نے میری حیثیت سے بڑھ کر مجھے نوازا تو اے مالک! ان محبتوں کی شمعیں یونہی جلتی رکھنا، انہیں بجھنے نہ دینا، ہر دم اس کے لبوں پر یہ دعا مچلتی رہتی۔

وقت سبک رفتاری سے گزرنے لگا، ان دنوں اس کا دلکش سراپا خاصا بے ہنگم ہو رہا تھا اس لیے وہ اپنے کمرے سے بہت کم نکلتی، جب کہ ڈاکٹر نے اسے چہل قدمی کا مشورہ دیا تھا۔ حسام خود اس بات کو سمجھتا تھا اس لیے وہ اکثر رات کو بڑی سی چادر میں چھپائے اس کے سنگ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی وہ کبھی دور نکل جاتی اور کبھی تھوڑا فاصلہ طے کر کے ہی تھک جاتی تھی، حسام اس کا خیال رکھتا وہ آگے تک جانا چاہتی تو وہ اسے دور تک لے جاتا اور اگر واپسی کے لیے کہتی تو وہ فوراً قدم موڑ لیتا ڈاکٹر ہونے کے ناتے وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسی حالت میں عورت کے مزاج میں چڑچڑاپن عود کر آتا ہے، اس لیے وہ کوشش کرتا کہ اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات نہ ہونے دے، کسی کسی وقت تو وہ خود حیران ہو جاتی کہ وہ اس کی بعض ایسی باتیں بھی مان جاتا ہے جو اس کے خیال میں اسے نہیں ماننا چاہیے تھیں۔

صبح اس کی طبیعت خاصی بوجھل ہو رہی تھی، اصل میں رات وہ ابا سے ملنے چلی گئی تھی، ان کی حالت اب بھی ویسی ہی تھی اس پر اماں، نادر کا سلوک ناقابل برداشت۔ وہ ان کی حالت پر کڑھتی رہی تھی اور اب بھی دل اور ذہن اس بوجھ سے آزاد نہیں ہوئے تھے، حسام ہاسپٹل جانے کے لیے

تیار ہو رہا تھا وہ کچھ دیر تک چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ پھر کیا خیال آیا کہنے لگی۔

''حسام......! آج آپ ہاسپٹل نہ جائیں۔'' وہ اس وقت ٹائی کی ناٹ لگا رہا تھا پلٹ کر اس کی طرف دیکھا، جانے کیا تھا اس کے چہرے پر، اس نے ٹائی کھینچ کر ایک طرف ڈال دی اور اس کے پاس آتے ہوئے کہنے لگا۔

''جو حکم...... نہیں جاتا۔'' وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھے گئی، گندمی رنگت جو صبح کے اجالے میں سرخی مائل ہو رہی تھی، چوڑی پیشانی پر گھنے بال جھکے آ رہے تھے اور خوبصورت ہونٹ جو اسے دیکھ کر ہر دم مسکرانے پر آمادہ رہتے تھے۔ اب بھی مسکراہٹ دبائے ہوئے تھے، اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جذبے لٹاتی ہوئیں جن میں پیار کا ساگر مچلتا تھا۔ وہ اس مچلتے ساگر میں ڈوبنے لگی۔

''یوں کیا دیکھ رہی ہو......؟'' وہ اس کا ہاتھ دباتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''ارے رابعہ بیگم......! ہمیں تو حسرت ہی ہے کہ کبھی تم بھی ہمیں تنگ کرو۔'' وہ خاموش رہی تو وہ اس کی ٹھوڑی چھو کر پوچھنے لگا۔

''ہاں...... نہیں۔'' دونوں جواب ایک ساتھ وہ ہنس پڑا۔

''آؤ یہاں لیٹو...... میں تمہارا چیک اَپ کروں۔'' اور اس کے ''نہیں نہیں'' کرنے کے باوجود اس نے زبردستی اسے لٹایا اور پھر بڑی سنجیدگی سے چیک اپ کرنے کے بعد جب سیدھا کھڑا ہوا تو کہنے لگا۔

''بس ایک ہفتہ، پھر اس مصیبت سے تمہیں چھٹکارا مل جائے گا۔''

''مصیبت نہ کہیں۔'' وہ فوراً بول اٹھی۔

''پھر کیا کہوں اس کی وجہ سے میں تمہاری ایک مسکراہٹ دیکھنے کو ترس گیا ہوں اتنی ڈل ہو گئی ہو کہ ہر وقت چہرے پر بیزاری چھائی رہتی ہے۔'' وہ خاموش ہو رہی۔

''خفا ہونے کی کوشش مت کرنا۔''

''میں بالکل خفا نہیں ہوں۔'' وہ اٹھ بیٹھی پتا نہیں کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

''ڈرپ لگا دوں۔''

''نہیں، میں مسلسل لیٹے لیٹے تھک جاتی ہوں۔''

''اچھا تو یونہی گلوکوز پی لو، ٹھہرو میں لے کر آتا ہوں۔'' وہ فوراً جا کر اس کے لیے ٹھنڈے پانی میں گلوکوز ملا لایا جسے پینے کے بعد وہ پھر لیٹ گئی۔

دن بھر وہ اسے بہلاتا رہا اور اس کا دھیان بٹانے کی خاطر اس نے پہلی بار اسے بے جی کے بارے میں بتایا کہ تقسیم ہند سے پہلے وہ کیا تھیں، وہ اس بارے میں لاعلم تھی، اس لیے حیران ہو کر

سنتی رہی پھر دوپہر میں وہ بے جی کے بارے میں سوچتے سوچتے ہی سو گئی تھی، شام میں اٹھی تو وہ اس سے کہنے لگا۔

"چلو میں تھوڑی تفریح کرا دوں۔"

"رات میں چلیں گے ٹہلتے ہوئے۔"

"مجھے ایک بندے سے ملنا ہے تم بھی چلو فریش ہو جاؤ گی۔" اسے سوچتے دیکھ کر کہنے لگا۔ "تم گاڑی میں بیٹھی رہنا۔"

"اچھا......!" اس نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور چادر لے کر اس کے ساتھ چل پڑی برآمدے میں بے جی مل گئیں۔ اس نے انہیں اپنے جانے کے بارے میں بتایا پھر اسے لے کر باہر نکل آیا۔

شام کی فرحت بخش ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی تو وہ قدرے سکون محسوس کرنے لگی۔

"پتا ہے حسام......!" وہ کہنے لگی "میں اس وقت سے بے جی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

"اچھا......!" وہ اس کی بات میں دلچسپی ظاہر کرنے کی غرض سے اشتیاق سے بولا۔

"وہ اپنے گھر والوں کا ذکر نہیں کرتیں......؟" وہ پوچھنے لگی۔

"زیادہ نہیں بلکہ ہمارے سامنے تو وہ گریز ہی کرتی ہیں شاید اس لیے کہ ان کے خیال میں کہیں ہم ان کی گزشتہ زندگی کو کریدنا نہ شروع کر دیں، اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ اپنے گزشتہ مذہب پر بات نہیں کرنا چاہتیں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

"اچھی بات تو ہے لیکن۔"

"لیکن یہ کہ ہمیں بے جی کی ایک بات پسند نہیں ہے۔"

"کون سی......؟"

"بعض ہندوانہ رسموں کو وہ اب تک اسی طرح مانتی ہیں۔"

"مثلاً......"

"مثلاً......" اس نے دہرایا اور سوچنے لگا کہ وضاحت کرے یا نہ کرے۔

"بتایئے ناں......" وہ واقعی جاننا چاہتی تھی وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔

"بے جی راکھی کی اہمیت کو اسی طرح تسلیم کرتی ہیں حالانکہ ہمارے مذہب میں اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔" پھر قدرے توقف کے بعد کہنے لگا "ہو سکتا ہے ہم اس بات کو کوئی اہمیت نہ دیے

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس راکھی کی بدولت بے جی، نائلہ اور ابرار کے درمیان دیوار بنی کھڑی ہیں۔"

"کیا مطلب......؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"جب ہم چھوٹے تھے تو ایک بار یونہی کھیل ہی کھیل میں بے جی نے نائلہ کے ہاتھ سے ابرار کی کلائی پر راکھی بندھوا دی تھی اور اب جب کہ نائلہ اور ابرار ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں بلکہ ابرار کے ہاں سے شادی کا پیغام بھی آچکا ہے تو بے جی کسی طرح نہیں مان رہیں، ان کا کہنا ہے کہ راکھی کے بندھن میں بندھنے کے بعد یہ دوسرا بندھن کسی طرح بھی ممکن نہیں۔"

"میرے خدا......!" وہ بے حد حیران ہوئی "بابا اس سلسلے میں کچھ نہیں کہتے۔"

"بابا نے کوشش تو کی ہے انہیں سمجھانے کی لیکن۔" وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے گاڑی پارک کرنے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگا۔

"یہاں کہیں جانا ہے آپ کو......؟" وہ اسے گاڑی روکتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"ہاں......! لیکن روڈ کے اس طرف وہاں پارکنگ کی جگہ نہیں ہے اس لیے میں نے یہاں روک دی تم چلو گی یا۔"

"نہیں میں یہاں ٹھیک ہوں۔"

"او کے...... میں دس منٹ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ گاڑی سے اترا اور احتیاط سے روڈ کراس کر کے دوسری طرف بنی عمارت میں چلا گیا۔

وہ نائلہ کے بارے میں سوچنے لگی، تو خیال آیا کہ وہ پچھلے کئی دنوں سے الجھی الجھی سی نظر آ رہی تھی اسے نائلہ سے ہمدردی محسوس ہونے لگی اور اپنی غفلت پر پشیمانی کہ گھر میں رہتے ہوئے بھی اس مسئلے سے بے خبر ہے لیکن اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا کسی نے اس کے سامنے ذکر ہی نہیں کیا تھا پھر بھی وہ اپنے آپ کو الزام دینے لگی، گاڑی کی پشت سے سر ٹکائے ہوئے اس کی نظریں بھاگتی دوڑتی گاڑیوں پر جم گئیں، قریب ہی کسی گاڑی کے بریک بڑی زور سے چرچرائے تو اس نے چونک کر دیکھا اور جیسے اس کا سارا بدن سن ہو گیا، بلی کا چھوٹا سا بچہ پہیے کے نیچے کچلا گیا۔ گاڑی بس کچھ دیر کو رکی پھر آگے بڑھ گئی اور اس کے لیے اس منظر کو دیکھنا اور اسی منظر میں بیٹھنا دوبھر ہو گیا طبیعت پہلے ہی بوجھل تھی اور اب تو لگ رہا تھا اگر کچھ دیر اور یہاں بیٹھی تو چیخ چیخ کر رونا شروع کر دے گی، دوسری طرف کا دروازہ کھول کر وہ نیچے اتری اور یہ سوچے بغیر کہ حسام بس ابھی آنے والا ہے اس کے پیچھے چل پڑی وہ اس وقت اپنے آپ میں نہیں تھی۔ اور یہ ایک فطری بات تھی کہ اب کچھ دنوں میں وہ خود ماں بننے والی تھی اس لیے ایک بلی کے بچے کی ناگہانی موت اس پر اس حد تک اثر انداز ہوئی کہ دل سہم کر رہ گیا تھا ہر طرف سے بیگانہ ہو کر اس نے مصروف شاہراہ پر

قدم رکھ دیے اور جب وہ اس چوڑی سڑک کے درمیان میں تھی تو ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی
کوشش میں تیز رفتار بسیں اس کے سر پر پہنچ چکی تھیں، اس میں بھاگنے کی سکت نہیں تھی اور یہ
انتہائی خطرناک تھا۔

"شاید وقت کا ظالم پنجہ......" اس نے سوچا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"رابعہ......!" چیختی چنگھاڑتی آوازوں میں سے یہ آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی اور پھر
جیسے کسی نے اسے بڑی زور سے دھکا دیا، فٹ پاتھ پر گرتے ہی اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔
اسے دھکیل کر وہ خود اس تک آنے میں ناکام ہو گیا تھا۔

"حسام......!" اس کے حلق سے دلدوز چیخ نکلی اور سامنے خون کا دریا اس کی تمام حسیں
مفلوج کر گیا۔ اور اگلے ہی پل کائنات کے سارے اندھیرے ایک ساتھ اس کی طرف بڑھتے چلے
آ رہے تھے۔

○○○

پورے پانچ دن بعد اسے ہوش آیا، وہ بھی اس طرح کہ صرف آنکھیں کھلیں ورنہ پورا جسم
اور خاص طور سے ذہن جیسے گہری نیند میں تھا، چھت پر نظریں مرکوز کیے وہ بے حس و حرکت پڑی
تھی۔ سسٹر نے اس کے کمرے میں جھانک کر دیکھا اور اس کی آنکھیں کھلی دیکھ کر فوراً ڈاکٹر کو بلا لائی
ڈاکٹر نے اس کا چیک اپ کیا اور چیک اپ کے دوران اس سے ہلکے پھلکے سوال کرتی رہی، وہ کچھ
سنتی تو جواب دیتی اسے تو کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، پھر ڈاکٹر نرس کو کچھ ہدایات دے کر
چلی گئی تو وہ پھر تنہا رہ گئی۔

"مجھے کیا ہوا ہے......؟" آہستہ آہستہ اس کا ذہن بیدار ہونے لگا......اور حواس بھی لوٹنے
لگے تب ایک سرگوشی جیسے کوئی قریب ہی کھڑا کہہ رہا ہو۔

"میں صرف جان دینے کی باتیں ہی نہیں کروں گا" اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور
نظریں زاویہ بدلتی ہوئی چاروں طرف بھٹکنے لگیں، در و دیوار کو چیرتی ہوئی آواز۔

"میں وقت آنے پر جان دے بھی دوں گا۔" قریب تھا کہ وہ چیخ پڑتی کہ بچے کے رونے کی
آواز نے اس کی توجہ کھینچ لی، اس نے چونک کر گردن موڑی اور کاٹ میں لیٹے بچے کو دیکھ کر اس کا
ہاتھ بے اختیار اپنے پیٹ پر چلا گیا۔

"ارے......!" وہ حیران ہوئی بے خبری میں وہ کتنے مراحل طے کر آئی تھی، بچے کو شاید
بھوک لگی تھی، وہ مسلسل روئے جا رہا تھا اس نے بے بسی سے آنکھیں بند کر لیں، چپ چاپ کتنے

آنسو آنکھوں کے کناروں سے نکل کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔

"کوئی تو آئے۔" اس کا دل شدت سے ایک ایک کو صدا دینے لگا اور پتا نہیں اس کی صدا
سنی گئی یا اوپر والے کو معصوم بچے کے رونے پر رحم آیا کہ دروازہ کھلا اور نائلہ آ گئی، دروازہ کھلنے کی
آواز پر ہی اس نے آنکھیں کھول دی تھیں اور نائلہ کو دیکھ کر اس کا دل درد سے پھٹنے لگا وہ جو اس پر
جان لٹا گیا تھا، وہ صرف اسی کا رفیق نہیں تھا اس لڑکی کا ماں جایا بھی تھا، نائلہ نے جلدی سے فیڈر بنا
کر بچے کے منہ سے لگائی پھر پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں مجرم ہوں، قاتل ہوں مجھے دار پر چڑھا دو۔" اس کے ہونٹوں میں الفاظ ٹوٹنے لگے۔

"نہیں بھابی......!" نائلہ نے بڑھ کر اس کی پیشانی پر اپنی پیشانی ٹیک دی۔

"شاید خدا کو یہی منظور تھا۔" نائلہ نے کہا تو وہ سسکیوں سے رونے لگی "آپ مت روئیں
رونا آپ کے لیے بے حد نقصان دہ ہے۔" وہ اور شدت سے رونے لگی۔

"بھابی پلیز......!" نائلہ اپنی انگلیوں سے اس کی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

"جب کوئی خوشی میری جھولی میں گرتی ہے، وہ اسے دبوچنے میں دیر نہیں کرتا۔"

نائلہ کیا کہتی خاموشی سے اس کا ہاتھ تھپکنے لگی۔

"بے جی کیسی ہیں......؟" وہ نظریں چراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ان کی حالت کا اندازہ آپ خود کر سکتی ہیں وہ ماں ہیں سنبھلتے سنبھلتے ہی سنبھلیں گی۔"

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ "آپ ہم سب کی فکر نہ کریں اپنے آپ کو سنبھالیں اس
بچے کی خاطر جسے حسام آپ کی جھولی میں ڈال گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ اس کی امانت کی
حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کریں گی۔"

اس نے نائلہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر گویا وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔

شام کو اس کی اماں آئیں، کافی دیر اس کے پاس بیٹھی رہیں، اسے تسلی کم اور اپنے گھر کا دکھڑا
زیادہ روتی رہیں۔

"کما ہو کر گھر بیٹھ گیا ہے کسی کام جوگا نہیں، اب میں نے کمال اور ناصر کو ایک ورکشاپ میں
کھڑا کر دیا ہے خود سلائی کرتی ہوں تب کہیں جا کر گھر کی گاڑی چلتی ہے تیرے باپ کا بس چلے تو
وہ ہم سے یہ چار پیسے بھی چھین لے۔" وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"اب تم واپس اپنے گھر آؤ گی یا......؟" وہ جانے سے پہلے پوچھنے لگیں۔

"اپنے گھر......" اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔

"ہاں اب وہاں تمہارا کیا رہ گیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہاں تھیں وہ تو رہا نہیں اور پتا نہیں اس

کے اماں اور ابا تمہیں رکھتے بھی ہیں کہ نہیں۔" اسے اندیشوں میں دھکیل کر وہ چلی گئیں۔

"میرے خدا جب وہی گھر میرا مقدر تھا تو یہ درمیانی عرصہ میرے نصیب میں کیوں لکھا۔" شکوہ ہونٹوں پر مچلنے لگا۔ "جب محبتوں سے آشنائی نہیں تھی۔ جب شہد آگیں لہجے نہیں سنے تھے۔ تب سب گوارا تھا، اور اب......" وہ تکیے میں منہ چھپا کر رو پڑی اور وہ محبتیں جنہیں اول روز اس نے دل کے نہاں خانوں میں چھپا رکھا تھا۔ انہیں بے آوازی صدائیں دینے لگی۔

اگلے دن نائلہ کے ساتھ بابا اور احتشام بھائی کو دیکھ کر اس کے سارے حوصلے ٹوٹ گئے۔ بابا کے سینے میں منہ چھپا کر اس نے سارے آنسو بہا ڈالے۔

"ہمارے ساتھ چل رہی ہو ناں......؟" بابا نے پوچھا۔ اور وہ خود یہی چاہتی تھی۔ اسی وقت جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

بے جی کا سامنا ہوا تو وہ ایک بار پھر بکھر گئی لیکن ان کا کمال تھا کہ وہ خود حوصلے سے کھڑی رہ کر اسے حوصلہ دیتی رہیں پھر اس کی گود سے بچے لے کر بغور دیکھتی ہوئی کہنے لگیں۔

"دیکھو حسام نے دوسرا جنم لیا ہے۔" اس تمام عرصے میں اس نے بے جی کے منہ سے یہ پہلی بات ایسی سنی جس نے اسے ان کی گزشتہ زندگی کا پتا دیا اور جس کے بارے میں حسام نے اپنے آخری وقت سے کچھ پہلے بہت کچھ بتایا تھا۔

○ ○ ○

وہی کمرا تھا اور اس میں رچی بسی اس کی مخصوص مہک بھی موجود تھی اور ہر چیز اسی جگہ جہاں وہ دونوں چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ ایک ایک قدم رکھتی رہی۔ کوئی نہ کوئی بات جو اب یاد بن گئی تھی۔ اس کے پیر پکڑ لیتی بچے کو مسہری پر لٹا کر وہ ہر ایک چیز کو چھو کر دیکھنے لگی۔ اس کی وہ ٹائی جو اس نے گلے میں سے کھینچ کر لاپروائی سے ڈریسنگ ٹیبل کے کونے پر ڈال دی تھی اب بھی وہیں موجود تھی اور نہیں موجود تھا تو وہ جس نے اس کے مقدر سے بڑی بڑی خوشیاں چھین کر اس کی جھولی میں ڈالنے کا وعدہ کیا تھا اور وہ اپنے وعدے کا سچا تھا کہ اس مختصر سے عرصے میں اس نے اس کے دامن میں وہ انمول خوشیاں ڈالی تھیں کہ اس کی سنگت میں گزرا ایک پل صدیوں پر بھاری تھا۔

"سنو میرے ہمنوا......! میں اپنی باقی ماندہ حیات کا ہر پل تمہارے نام لکھتی ہوں۔" اس نے عہد کیا۔

رات میں نائلہ اور صبیحہ کے ساتھ صائمہ بھابی بھی اس کے کمرے میں آ بیٹھیں اور ادھر ادھر کی باتوں سے اسے بہلانے کی کوشش کرتی رہیں۔

"بھابی......! اس کا نام کیا رکھیں گی......؟" صبیحہ بچے کو چھو کر پوچھنے لگی۔

"جو تم رکھ دو۔"

"نہیں بھابی......! آپ نے کچھ سوچا تو ہوگا۔"

"میں نے......" وہ پر سوچ انداز میں بولی۔ "حسام کو 'علی' نام پسند تھا۔"

"بس تو اس کا نام علی ہے۔" دونوں بہنوں نے اسی وقت فیصلہ دے دیا۔

"چلو......! اب تم لیٹ جاؤ۔ بہت دیر سے بیٹھی ہوئی ہو۔" صائمہ بھابی اٹھتے ہوئے کہنے لگیں۔ "نائلہ صبیحہ......! چلو...... رابعہ کو سونے دو۔"

"چلیں......" نائلہ کھڑی ہوئی پھر پہلے اسے لٹا کر اچھی طرح کمبل اوڑھایا۔ اس کے بعد صائمہ بھابی کے ساتھ باہر نکل گئی۔

وہ جب سے اس گھر میں آئی تھی، بڑے سکون سے رہتی اور پرسکون نیند سوتی تھی اور آج وقت کے ظالم پنجے نے اس کی پرسکون نیند چھین کر اس کی آنکھوں کو رت جگا بخش دیا تھا۔ تمام رات وہ کروٹیں بدلتی اور چونک چونک کر اٹھتی رہی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

زندگی بہت اداس اور بوجھل ہو گئی تھی۔ در و دیوار سے ٹپکتی ویرانی دل دہلائے دیتی تھی۔ کچھ دن پہلے یہاں پر بے فکری تھی اور کھلکھلاتے چہرے تھے اور اب تو ہر چہرہ سہما ہوا دکھائی دیتا تھا اور سب کی آنکھوں میں ایک جیسے سوال مچلتے۔

یہ سب کیا ہو گیا......؟

کیسے......؟

ہمارے ہی ساتھ کیوں ہوا......؟

بے جی اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ پہلے دن جب وہ گھر میں داخل ہوئی تھی تو ان سے سامنا ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے انہیں نہیں دیکھا۔ ایک تو وہ خود بھی کسی ضرورت کے علاوہ کمرے سے نہیں نکلتی تھی۔ بے جی کے کمرے میں خود سے جانے کی ہمت جانے کیوں وہ اپنے آپ میں نہیں پاتی تھی۔ شاید یہ خیال کہ وہ ان کے بیٹے کی قاتل ہے۔ حقیقت میں وہ اپنے آپ کو مجرم تصور کرتی۔

کاش! وہ اس دن اس کے پیچھے نہ جاتی۔ وہیں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتی۔ تو وہ جس طرح گیا تھا اسی طرح واپس بھی آ جاتا۔ یا کاش وہ آنے میں دیر کرتا۔ یہاں تک کہ وقت کے ظالم پنجے کی گرفت میں وہ خود آ جاتی۔

کاش......!

اے کاش......!!

وہ کتنی باتیں فرض کرتی اور اندر سے ٹوٹتی جا رہی تھی۔ زندگی نے پہلے ہی بہت زخم لگائے تھے اور یہ آخری زخم تو بہت کاری تھا۔

جس دن حسام کا چالیسواں ہوا اسی دن اس کا چھلہ۔ اس دن عورت بہت ہلکی پھلکی ہو جاتی ہے۔ یوں جیسے حقیقی معنوں میں نئی زندگی میں قدم رکھا ہو لیکن اس کا دل اور زیادہ بوجھل ہو گیا تھا۔ گھر میں قرآن خوانی تھی اور سب آنے والے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظروں میں اس کے لیے ہمدردی تھی۔

"اتنی سی عمر اور یہ روگ......" دبی دبی سرگوشیاں۔

"آگے پہاڑ سی زندگی کیسے کٹے گی......؟"

وہ سر جھکائے خاموشی سے سب کی سرگوشیاں سنتی رہی اور جب ضبط کا بندھن ٹوٹنے لگا، آنکھوں کا پانی روکے نہ رکا تب وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس کی اماں بھی آئی ہوئی تھیں۔ قرآن خوانی کے بعد کافی دیر تک بے جی کے پاس بیٹھی رہیں اور ان کے جانے سے پہلے بے جی اس کے کمرے میں آ کر کہنے لگیں۔

"تمہاری اماں پوچھ رہی ہیں، تم ان کے ساتھ جاؤ گی یا......؟" وہ کتنی دیر تک ان کی طرف دیکھتی رہی۔ شاید وہ خود کہہ دیں تم مت جاؤ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ لیکن انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ یوں کھڑی رہیں جیسے اس کے جواب کی منتظر ہوں۔

"بے جی......! مجھے اپنے سے جدا مت کریں۔" اسے خود کہنا پڑا۔ بھیگے بھیگے لہجے میں التجا تھی۔ "آپ اماں سے کہہ دیں کہ میں یہاں رہوں گی۔"

"تم یہاں نہیں رہ سکو گی۔"

"کیوں......؟ کیوں نہیں رہ سکوں گی......؟"

"یہاں زندگی بہت دُشوار ہوگی۔"

"مجھے ساری دشواریاں قبول ہیں لیکن خدا کے لیے مجھے یہاں سے جانے کے لیے مت کہیں۔" وہ رونے لگی۔ بے جی کچھ دیر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں۔

"بہر حال میں تمہیں کچھ وقت دیتی ہوں۔ خوب اچھی طرح سوچ لو پھر فیصلہ کرنا۔"

اس نے انہیں کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا پھر ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

رات اس کے مقدر کی طرح سیاہ تھی۔ ہر طرف خاموشی اور گہرا سناٹا تھا۔ تاریکی میں اس نے وال کلاک پر نظریں جما دیں۔ دو بج رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس

نے سونے کی کوشش بھی تو نہیں کی تھی۔ بے جی نے سوچنے کے لیے کہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی۔ کیا سوچے۔ جانے بے جی نے کن دشواریوں کی طرف اشارا کیا تھا۔ اس کا ذہن اُن اَن دیکھی دشواریوں تک رسائی حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ جبکہ گزشتہ زندگی کی دشواریاں اسے اب بھی ازبر تھیں۔ وہ بھولی نہیں تھی۔ جب ابا نشے میں اپنے حواس کھو کر امی پر چڑھ دوڑتے تھے۔ وہ اور فراز...... سہم کر کونے کھدروں میں پناہ ڈھونڈتے تھے۔ ابا پہلے چیختے چلاتے، گالیاں دیتے۔ وہ شاید امی سے پیسوں کا مطالبہ کرتے تھے اور امی کے مسلسل انکار پر وہ اس قدر مشتعل ہوتے کہ مارنے پر آ جاتے۔ جو چیز ہاتھ لگتی وہی کھینچ مارتے اور آخر کو فراز کو مار دینے کی دھمکی۔ امی ہاتھ جوڑ کر فریاد کرتیں اور پھر جو کچھ ان کے پاس ہوتا ابا کے حوالے کر دیتی تھیں۔ ابا ہی کی وجہ سے فراز جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اور فراز کے غم نے امی کی جان لے لی۔ پھر ایک دوسری عورت جو ابا کی زندگی میں تو بہت پہلے داخل ہو چکی تھی۔ امی کے بعد اس گھر میں بھی داخل ہو گئی۔ جس کے بارے میں ابا نے کہا تھا یہ تمہاری ماں ہے اور وہ ایک عمر اس میں اپنی امی کا عکس تلاش کرتی رہی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں صرف سوتیلی ماں تھی۔ اس نے جو سلوک چاہا اس کے ساتھ روا رکھا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ بابل کے آنگن میں وہ اس عذاب زندگی سے کبھی نہیں نکل سکی تھی۔ لیکن اوپر والے نے شاید اسے مایوسیوں سے نکالنے کی خاطر کچھ اچھے دنوں کی جھلک دکھا دی تھی اور اچھے دن تھوڑے سہی پھر بھی اس کی گزشتہ زندگی پر بھاری تھے۔

"یہاں زندگی بہت دشوار ہوگی۔" بے جی کہہ گئی تھیں۔

"شاید بے جی نے وہ دشواریاں نہیں دیکھیں جن سے گزر کر میں یہاں تک آئی ہوں۔" وہ سوچنے لگی۔ "اگر بے جی اگر ان کی ایک جھلک بھی دیکھ لیتیں تو ایسی بات نہ کہتیں اور پھر میں اکیلی نہیں ہوں جو واپسی کے لیے سوچوں۔ میرے ساتھ علی ہے جو حسام اپنی امانت کے طور پر میری جھولی میں ڈال گئے ہیں۔ اور اس امانت کی...... حفاظت اور پرورش میں یہاں بہتر طور پر کر سکتی ہوں۔ جب کہ اس ماحول میں یہ قطعی ناممکن ہے۔"

آخر میں اس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا کہ وہ واپس نہیں جائے گی۔

اگلے دن وہ بے جی کے سامنے سر جھکائے کھڑی کہہ رہی تھی۔

"بے جی......! میں واپس نہیں جاؤں گی۔ میں یہاں رہوں گی۔ آپ کے پاس۔ مجھے اور علی کو آپ کی ضرورت ہے۔"

"تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے......؟"

"جی......!"

"ٹھیک ہے اپنے کمرے میں جاؤ۔"

وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ شاید قدرے...... مطمئن بھی تھی کہ وہ یہ محبتوں بھرا سائبان اس سے چھنے گا نہیں۔ کچھ دیر ہی گزری تھی کہ بے جی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئیں۔ ان کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سے گٹھڑی تھی جو آتے ہی انہوں نے اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"تم وہ دعا ہو۔" تین لفظوں میں انہوں نے اس پر اس کی حقیقت آشکار کرا دی۔

"بے جی......!" ہونٹوں کی بے آواز جنبش۔

"تم نے اپنے لیے یہ راستہ خود منتخب کیا ہے۔"

بے جی کا ٹھہرا ہوا اور سفاک لہجہ۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"اب یہ پرخار راستہ ہی تمہارا مقدر ہے۔" انہوں نے کہا پھر بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی جس میں فقط دو چوڑیاں ہی رہ گئی تھیں اور انہیں بے جی نے اپنی مٹھی میں لے کر اس طرح دبایا کہ وہ چور چور ہو گئیں۔ کچھ کانچ اس کی کلائی میں پیوست ہوئے کچھ بے جی کی ہتھیلی میں چبھے لیکن انہوں نے پروا نہیں کی۔ گٹھڑی کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"اس میں تمہارے کپڑے ہیں، ابھی پہن لو۔" وہ یونہی کھڑی انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب وہ کمرے سے نکل گئیں۔ تب اس نے اپنی کلائی کی طرف دیکھا جس پر جا بجا خون کے ننھے منے قطرے چمک رہے تھے۔ اسے چبھن کا احساس ہونے لگا تو اس نے بڑی احتیاط سے کانچ کے ریزے صاف کیے اور کلائی کو دوسری ہتھیلی سے تھام لیا پھر فوراً ہی اسے گٹھڑی کا خیال آیا تو وہ اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ سفید ململ کی ساڑھی اور اسفنج کی دو پٹی والی چپل۔

"پتا ہے رابی......! بے جی نے اپنا مذہب تو چھوڑ دیا۔ لیکن بعض روایات نہیں چھوڑ سکیں۔" حسام نے بے جی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا۔

"اگر بے جی کے گزشتہ مذہب میں بھی "ستی" (زندہ جلا دینا) ہونے کی روایت ہوتی تو شاید وہ مجھے حسام کے ساتھ ہی دفن بھی کر دیتیں۔" اس نے سوچا اور گٹھڑی لے کر ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے بالوں کو کس کے ایک چوٹی میں گوندھ رہی تھی۔

"اے وقت میں کبھی تجھے مات نہیں دے سکوں گی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میرے دل میں ایک ذرا سا اطمینان ہی تو تھا۔ تو نے وہ بھی۔"

"بھابی......!" نائلہ نے اندر آ کر اس کی سوچوں کو منتشر کر دیا۔ وہ ساڑھی کا پلو سر پر جماتی

ہوئی پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"آپ......!" نائلہ سر تا پا اسے دیکھتے ہوئی بولی۔ پھر بڑھ کر اس کا پلو کھینچ لیا۔

"آپ ہر دم ہمیں یہ احساس دلانا چاہتی ہیں کہ ہمارا بھائی نہیں رہا۔ خدا کے لیے اتار دیجیے یہ لبادہ۔" اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ نائلہ جانے کیا سمجھی۔ چیخ چیخ کر بے جی کو آواز دینے لگی۔ بے جی کے ساتھ صبیحہ اور صائمہ بھابی بھی بھاگی چلی آئیں۔

"دیکھیے تو بے جی......! بھابی نے یہ کیسا روپ دھار لیا ہے ان سے کہیے ہمیں تلخ حقیقت سمجھانے کی کوشش نہ کریں ہمیں۔ اس فریب میں مبتلا رہنے دیں کہ ہمارا بھائی کہیں آس پاس موجود ہے۔"

"نائلہ......!" بے جی نے اسے خاموش کرا دیا۔

"اپنے کمرے میں جاؤ۔"

"نہیں...... پہلے بھابی سے کہیں۔"

"رابعہ نے ہمارے کہنے پر یہ رُوپ دھارا ہے۔" بے جی نے کہا تو نائلہ ایک دم خاموش ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ یوں جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔

"میں کسی کو فریب میں نہیں دیکھنا چاہتی۔" بے جی کہنے لگیں۔

"حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو بہرحال حقیقت ہوتی ہے اور اس سے نظریں چرانا بزدلی ہے۔"

"بے جی......!" نائلہ ہاتھوں میں چہرا چھپا کر رو پڑی۔

"بھابی کو سفید کفن پہناتے ہوئے آپ کو خیال نہیں آیا کہ حسام انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتا تھا۔ ذرا سوچیے تو کتنی تکلیف پہنچی ہوگی اسے۔" پھر صبیحہ نے بھی نائلہ کا ساتھ دیا لیکن بے جی پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ دونوں بہنوں کو روتا چھوڑ کر وہ کمرے سے نکل گئیں۔

گھر میں دبا دبا سا احتجاج جاگ اٹھا تھا۔ بے جی اکیلی تھیں اور بقیہ سارے گھر والے ایک طرف۔ پھر بھی بے جی کو ان کے مؤقف سے نہ ہٹا سکے۔ گھر کا ماحول خاصا کشیدہ ہو گیا تھا۔ اور وہ اس کا ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھنے لگی۔ تاہم صبیحہ اور انعام اسے بھی احتجاج پر اکساتے، لیکن وہ بزدل تھی، ان کے حوصلہ دلانے پر بھی اپنے اندر ہمت پیدا نہ کر سکی۔ کیونکہ بے جی کی چبھتی ہوئی نظریں وہ ہر وقت اپنے وجود پر محسوس کرتی تھی اور اسے ڈر تھا کہ کہیں بے جی اس سے یہ سائبان چھین نہ لیں۔ گھر کے باقی لوگ اب بھی جب موقع دیکھتے بے جی کو قائل کرنے کی کوشش کرتے اور جب ایسی بات ہوتی تو گھر کی فضا نئے سرے سے مکدر ہونے لگتی تھی اور وہ ایسی ہی فضا سے نکلنے کی خاطر

اس روز ان تینوں بہن بھائی سے الجھ پڑی۔

"تم لوگ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ جب میرے اندر کوئی خواہش ہی نہیں ابھرتی تو تم لوگ کیوں الجھتے ہو۔ ساری خواہشیں اور زندگی کا مزہ تو اس کے ساتھ تھا، وہ نہیں رہا تو اب کچھ بھی نہیں چاہیے مجھے۔"

"بات چاہنے نہ چاہنے کی نہیں ہے بھابی۔ آپ یہ دیکھیں کہ بے جی ایک ہندوانہ رسم کو اس گھر پر مسلط کر رہی ہیں۔"

"کیا کیا ہے انہوں نے۔ ایک سفید لبادہ ہی تو اڑھایا ہے مجھے۔"

"بات اگر اس سفید لبادے تک رہے تو ہم خاموش ہو جائیں گے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ بے جی یہیں تک بس نہیں کریں گی۔"

"پھر......؟"

"مزید کچھ کہنا قبل از وقت ہے بلکہ کہنے پر دل آمادہ بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے اس بات کو بعد کے لیے اٹھا رکھیے۔"

نائلہ نے کہا تو وہ فوراً کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے لیکن تم لوگ اب بے جی سے نہیں الجھو گے۔"

"اسے کہتے ہیں مدعی سست گواہ چست۔" انعام کہنے لگا۔

"یعنی ہم آپ کی خاطر لڑ رہے ہیں اور آپ ہی میدان چھوڑ رہی ہیں۔"

"نہ صرف خود چھوڑ رہی ہیں بلکہ ہمیں بھی چھوڑنے پر مجبور کر رہی ہیں۔" صبیحہ نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں چلیں......؟"

"نیند آ رہی ہے، اب سوؤں گی۔"

"چلو ہم بھی چلتے ہیں۔" وہ تینوں جانے لگے تو اس نے نائلہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھوں سے رکنے کا اشارہ کیا۔

"تم دونوں جاؤ۔ میں کچھ دیر بھابی کے پاس بیٹھوں گی۔" نائلہ دوبارہ بیٹھ گئی۔ پھر جیسے ہی صبیحہ اور انعام کمرے سے نکلے، وہ پوچھنے لگی۔

"کیا بات ہے......؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ بس یوں ہی میرا دل تم سے باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔" علی کو چادر اوڑھانے کی غرض سے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا۔

"بھابی......! بلا تمہید وہ بات کہہ دیں جس کے لیے آپ نے مجھے روکا ہے۔" وہ حیران ہوئی اور دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی قائل بھی۔ پھر بھی کہنے لگی۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ میں نے تمہیں خاص بات کے لیے روکا ہے۔"

"ہاں......!" وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس کے کہنے کے مطابق بغیر تمہید باندھے کہنے لگی۔

"حسام نے مجھے ابرار کے بارے میں بتایا تھا اور یہ بھی کہ بے جی......" اس کی باقی بات نائلہ کی طویل سانس میں دب گئی۔

"کیا بے جی کے رویے میں کچھ لچک پیدا ہوئی......؟" وہ پوچھنے لگی۔

"نہیں......" نائلہ کے ہونٹوں نے ایک ذرا سے نہیں کو کیا چھوا کہ دل کا تمام احوال اس کے چہرے پر رقم ہو گیا۔ وہ کتنی دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ دکھ بھی ہوا۔ خود کمزور تھی اس کے باوجود اسے حوصلہ دینے لگی۔

"تم بے جی سے بات کرو۔"

"صرف بات......ہم تو ان سے لڑ لڑ ہارے۔" افسوس اور تلخی نے اس کی آنکھوں میں نمی اتار دی۔

"کتنی عزیز ہیں......اور جب تک میں آپ کو آپ کا کھویا ہوا مقام نہیں دلا دوں گی چین سے نہیں رہوں گی۔"

"کیا ہوا ہے مجھے، ٹھیک تو ہوں۔"

"آپ کیونکہ ہر بات کو مقدر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتی ہیں اس لیے ایسا کہہ رہی ہیں ورنہ تو آپ بالکل بھی ٹھیک نہیں ہیں۔"

"میری بات چھوڑا......تم اپنی بات کرو۔"

"اپنی بات تو اب اتنی سی ہے کہ امتحان سر پر ہیں اور میجر عاطف کے گھر والوں کا آنا جانا کچھ زیادہ ہے۔ مجھے لگتا ہے، بے جی میرے امتحانوں کا انتظار کر رہی ہیں۔ اس کے بعد......"

"اور وہ ابرار......" وہ فوراً بول پڑی۔

"ابرار خواب ہو گیا ہے۔"

"جب تم احتجاج کا حوصلہ رکھتی ہو تو پھر کیوں ہتھیار ڈال رہی ہو......؟"

"میرے احتجاج کی فوری شنوائی ممکن نہیں ہے اور میں ابرار کو ایک طویل عرصہ انتظار کی سیڑھیوں پر کھڑا رہنے کو نہیں کہہ سکتی۔"

"کیا تمہیں اس پر بھروسا نہیں ہے......؟"

"بھروسے کی بات نہیں ہے بھابی......! اصل میں حسام کے بعد اب بے جی سے
دل نہیں چاہتا۔" وہ طویل سانس لے کر ریک کی طرف دیکھنے لگی۔ جس پر حسام کی تصویر رکھی تھی۔

○○○

وقت کا پہیہ اپنی مخصوص رفتار سے چل رہا تھا ان دنوں وہ تینوں بہن بھائی اپنے امتحانوں
میں مصروف تھے اس لیے کوئی بھی اسے وقت نہیں دے پا رہا تھا۔ وہ سارا سارا دن کمرے میں
علی کے ساتھ مصروف رہتی۔ صائمہ بھابی بھی فارغ نہیں تھیں۔ کیونکہ امتحانوں کے بعد ان کی
شادی طے پائی تھی بے جی کے ساتھ تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ اس کا بھی دل چاہتا وہ بے جی کا
ہاتھ بٹائے اور وہ ایک بار ان کے پاس گئی بھی تھی لیکن انہوں نے صاف منع کر دیا۔ "تم کسی چیز کو
ہاتھ نہیں لگاؤ گی۔" انہوں نے اتنی سختی سے کہا تھا کہ وہ پھر ان کے سامنے تک جانے کی جرأت نہ کر
سکی۔

پھر جیسے ہی امتحان ختم ہوئے گھر میں شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر
کچن کی ہو گئی۔ وقت بے وقت مہمانوں کی آمد، وہ شاید ان کی تواضع پر مقرر ہو گئی تھی۔ کمرے سے
کچن اور کچن سے کمرا بس یہی ایک اس کا راستہ تھا۔ اس راستے سے ہٹ کر اول تو وہ چلتی نہیں تھی
اور جو کسی بہت اہم ضرورت کے تحت کسی اور طرف نکلتی تو بے جی ایسی نظروں سے دیکھتیں کہ وہ فوراً
اپنے کمرے میں پناہ لیتی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ بے جی اسے منحوس تصور کرتی ہیں۔ اسی لیے ان کی
کوشش ہے کہ اس گھر کی خوشیوں پر اس کا سایہ تک نہ پڑنے پائے۔ مایوں اور مہندی کی رسم میں
انہوں نے اسے خاص ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے کمرے سے نہ نکلے۔ اسے خود بھی احساس تھا اور وہ
وقت کے ظالم پنجے سے بھی خوفزدہ تھی۔ اس لیے اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ ایک دو بار صبیحہ اسے
بلانے بھی آئی لیکن اس نے پہلے ہی سے سر میں دوپٹہ باندھ لیا تھا۔ اور شدید سر درد کا بہانا کر کے
اسے ٹال دیا۔

بارات کا انتظام گھر پر تھا۔ کوٹھی کے سامنے والے لان میں کرسیاں بچھا کر مردوں کے بیٹھنے کا
انتظام تھا جبکہ پچھلے لان میں خواتین کا۔ کھانے کا انتظام بڑے ہال کمرے اور چھت پر کیا گیا تھا۔
وہ شاید آج بھی کمرے سے نہ نکلتی لیکن شاید کچھ خواتین نے بے جی سے اس کی بابت پوچھا اس
لیے بے جی نے خود آ کر خواتین کے حصے تک جانے کی اجازت دی۔

جس وقت وہ پچھلی طرف لان میں آئی بہت سی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ جو اس کی

طرف متوجہ نہیں تھا وہ بھی متوجہ ہوا۔ سفید ساڑھی میں لپٹا اس کا نازک سراپا جگمگاتی برسات میں
نمایاں ہو گیا تھا۔ ہر قسم کے میک اپ سے پاک اس کا اجلا اجلا چہرا جس پر معصومیت کے ساتھ ایک
سوز تھا جو ہر نظر کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا اس میں اس کی ارادی کوشش کو قطعی دخل نہیں تھا بلکہ وہ اتنی
بہت ساری نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر کے نروس ہو رہی تھی۔

"ارے صبیحہ......! یہ کون ہے......؟" اسے اپنے عقب سے آواز آئی۔

"مجھے تو کوئی روح لگ رہی ہے۔ جو بھٹک کر یہاں آ گئی ہو۔" صبیحہ کے جواب دینے سے
پہلے ہی دوسری آواز آئی۔

"ہے کتنی کومل سی...... اس عام سی ساڑھی میں غضب ڈھا رہی ہے۔"

"کون ہے......؟"

"میری بھابی......!"

"ارے......!" حیرت اور اشتیاق کی ملی جلی آوازیں۔ اس نے قدم آگے بڑھا
دیے۔ لیکن ایک جگہ پھر اس کے قدم رک گئے۔ کچھ خواتین بے جی سے اس کے بارے میں
بات کر رہی تھی۔

"بیگم حیات......! آپ کی بہو کو بہت کم عمری میں دھکا لگا۔"

"ہاں ابھی تو بے چاری کے کھیلنے کھانے کے دن تھے۔"

ایک اور آواز......

"ایک بیٹا بھی ہے ناں......؟"

"ایک بات کہوں بیگم حیات......!" کسی نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔

"آپ کا ماشاءاللہ ایک اور بیٹا بھی تو ہے، اس سے نکاح کر دیں۔"

"کیا......؟" بے جی کی آواز میں ناگواری تھی۔

"ہاں......! گھر کی عزت گھر ہی میں رہے گی...... اور پھر ماشاءاللہ لڑکی بہت پیاری
ہے۔ صورت کی بھی سیرت کی بھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو بیٹے کو لے کر چلتی بنتی۔"

"بیگم خان ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ فرصت میں سنجیدگی سے سوچیے گا۔ اس طرح آپ کا پوتا یتیمی
سے بچ جائے گا۔"

وہ بے جی کا جواب سنے بغیر آگے بڑھ گئی۔ ہر طرف وہی موضوع تھا۔ اس نے گھبرا کر اندر
کی راہ لی۔ برآمدے سے گزر کر گیلری میں قدم رکھا تو بری طرح کسی سے ٹکرا گئی۔ فوراً پیچھے ہٹنے
کے نتیجے میں پیر مڑ گیا جس سے توازن قائم نہ رکھ سکی۔ گرنے کو تھی کہ سامنے والے نے بڑھ کر

تھام لیا۔

‘‘میرے خدا......!’’ دھڑکنیں ساتھ چھوڑنے لگیں۔ مارے خوف کے اس کے ہاتھ جھٹک کر فوراً دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

‘‘آپ......!’’ وہ شاید تعارف چاہتا تھا اور وہ راہ فرار ڈھونڈنے لگی۔

‘‘میں آصف ہوں۔ آصف جہانگیر۔’’ اس کے خاموش رہنے پر اپنا تعارف کرا ڈالا۔ انداز بتا رہا تھا ایک عمر کی تلاش ختم ہوئی اور اس کے لیے تو یہ ساری باتیں بے معنی تھیں۔ کچھ دروازے اس نے خود بند کیے تھے اور کچھ پر بے جی نے پہرے بٹھا دیے تھے۔ وہ اس کی نظروں کی وارفتگیوں کو نظر انداز کرتی اسی خاموشی سے اس کے قریب سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے خیال نہیں آیا کہ باہر کھڑا آصف جہانگیر کتنی دیر تک اس کے بند دروازے کو دیکھتا رہا تھا اور قدم بڑھانے سے پہلے اس بند دروازے پر دستک دینے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔

پھر رخصتی سے کچھ پہلے نائلہ خود اس کے کمرے میں آ گئی۔ اس کے حیرت سے دیکھنے پر کہنے لگی۔

‘‘میں جانتی ہوں، بے جی نے آپ کو میرے پاس آنے سے منع کیا ہو گا اس لیے میں خود آپ سے ملنے آ گئی ہوں۔’’ وہ ڈر گئی۔ خوفزدہ ہوئی کہیں اس کا منحوس سایہ نائلہ کی خوشیوں کی راہ میں حائل نہ ہو۔

‘‘تم یہاں کیوں آ گئیں......؟’’

‘‘آپ جو نہیں آئیں۔’’

‘‘کوئی مصلحت تھی جبھی تو نہیں آئی۔ اب پلیز تم جاؤ۔’’

‘‘آپ سے ملے بغیر اور آپ کی دعائیں لیے بغیر تو نہیں جاؤں گی۔’’

‘‘کیا......؟’’ وہ پیچھے ہٹنے لگی۔

‘‘جتنا مرضی بھاگ لیں۔ یہ طے ہے کہ میں آپ سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی چاہے بارات تھک کر واپس ہی کیوں نہ چلی جائے۔’’

‘‘ایسی باتیں منہ سے مت نکالو۔’’ وہ چیخ پڑی

‘‘تو پھر آیئے۔’’ نائلہ نے دونوں بازو پھیلا دیے۔ وہ اس کی ضد جانتی تھی اس لیے بڑھ کر اس کے بازوؤں میں سما گئی۔

‘‘سدا سہاگن رہو۔’’ وہ یہی دعا دے سکتی تھی۔

‘‘کاش! میں بھی پلٹ کر یہی دعا آپ کو دے سکتی۔’’ دونوں کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔ وہ فوراً اس سے الگ ہو گئی۔

‘‘اب تم جاؤ ورنہ بے جی خفا ہوں گی۔’’ نائلہ نے بڑھ کر کار میں بیٹھے علی کو پیار کیا، پھر جس طرح آئی تھی اسی طرح چلی گئی۔

○○○

بے جی کو جہاں نائلہ کی شادی بخیر و خوبی ہو جانے پر اطمینان تھا وہاں لوگوں کی باتوں نے انہیں سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ سوچنے لگیں، ایسا نہ ہو کسی دن خضر حیات کے دل میں بھی یہ بات سما جائے کہ وہ رابعہ کا نکاح انعام سے کرنے کی بات کرنے لگیں۔ گو کہ وہ ان کے سامنے بھی اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کا حوصلہ رکھتی تھیں۔ پھر بھی شاید اندر کہیں کسی خدشے نے انگڑائیاں لینی شروع کر دی تھیں کہ وہ کسی مقام پر بالکل تنہا ہو کر کمزور نہ پڑ جائیں ابھی تو خیر خضر حیات اگر ان کی حمایت نہیں کرتے تھے تو مخالفت بھی نہیں کرتے تھے۔ اس لیے وہ اطمینان سے تھیں اور اب لوگوں کی باتوں نے ان کا اطمینان تقریباً چھین لیا تھا۔

‘‘ایک بیوہ عورت کی دوبارہ شادی قطعی ناممکن ہے۔’’ وہ جو کئی روز سے یہ بات سوچ رہی تھیں اس وقت بلا ارادہ ان کے منہ سے نکل بھی گئی اور خضر حیات جو اس وقت اخبار دیکھنے میں معروف تھے ان کی بات پر چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ پھر کہنے لگے۔

‘‘کس نے کہا......؟’’

‘‘میں کہہ رہی ہوں۔’’

‘‘بالکل غلط کہہ رہی ہیں آپ ہمارے مذہب میں ایسی کوئی بندش نہیں ہے۔’’

بے جی کو افسوس ہوا کہ انہوں نے یہ موضوع کیوں چھیڑ دیا۔ اب ایسا نہ ہو خضر حیات انہیں دلیلوں سے قائل کرنے کی کوشش کریں۔

‘‘بہر حال...... میں اسے مناسب نہیں سمجھتی۔’’ وہ سرسری انداز میں اپنا خیال ظاہر کرتی ہوئی ان کے پاس سے اٹھ کر چلی گئیں۔

وقتی طور پر بات ٹل گئی لیکن وہ جانتی تھیں کہ کسی نہ کسی وقت یہ موضوع تفصیل سے زیر بحث آئے گا اور وہ ایسا وقت آنے سے پہلے ہی اس کا سدباب کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے بہت زور و شور سے انعام کے لیے لڑکی کی تلاش کرنی شروع کر دی۔ وہ جو گھر سے زیادہ نکلتی نہیں تھیں اب ہر تیسرے چوتھے دن کہیں نہ کہیں جا رہی ہوتیں۔ اس روز بھی ناشتے کی ٹیبل پر وہ کہیں

جانے کی بات کر رہی تھیں جب احتشام کہنے لگے۔

"بے جی......! آپ کو ادھر ادھر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ لڑکی تو گھر ہی میں موجود ہے۔"

"کون......؟" وہ یونہی بے دھیانی میں احتشام کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"میں رابعہ کی بات کر رہا ہوں۔"

"یہاں رابعہ کا کیا ذکر...... میں انعام کی شادی کی بات کر رہی ہوں۔"

"میں بھی انعام اور رابعہ کی شادی......"

"احتشام......!" ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بے جی زور سے چلائیں اور وہ جو چائے کی ٹرے لے کر اندر آ رہی تھی ڈر کر وہیں رک گئی۔

"میں نے ایسی کوئی نامناسب بات تو نہیں کہی بے جی......!"

"میرے نزدیک سب سے نامناسب بات یہی ہے سمجھے تم......!"

"آخر آپ کو رابعہ کے بارے میں سوچنا ہے کہ نہیں۔"

"نہیں......" صاف انکار۔

"کیوں......؟ آخر وہ کب تک اس طرح زندگی گزارے گی......؟"

"یہی زندگی اس کا مقدر ہے۔" انتہائی غصے کے عالم میں اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئیں اور وہ جو دروازے کے اس طرف کھڑی سوچ رہی تھی کہ اندر جائے یا یہیں سے واپس پلٹ جائے کہ تیزی سے نکلتی ہوئی بے جی اسی سے جا ٹکرائیں، اس کے ہاتھوں سے چائے کی ٹرے چھوٹ گئی اور ایک شور اس خاموش فضا میں گونجتا چلا گیا۔

"کیا ہوا......؟" ڈائننگ روم سے ایک ساتھ کئی آوازیں آئیں اور اس سے پہلے کہ کوئی یہاں تک آتا، بے جی اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی اس کے کمرے میں لے گئیں۔

"تم نے اسی لیے اس گھر میں رہنا منظور کیا تھا۔" بے جی کا سفاک لہجہ۔ وہ رونے لگی۔

"میرا یقین کریں بے جی میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔"

"سوچنا بھی مت۔" ایک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑ کر وہ کمرے سے نکل گئیں۔ اور وہ ابھی اس نئی صورتِ حال اور افتاد کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ ایک کے بعد ایک سب اس کے کمرے میں چلے آئے۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھے اور سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا بیٹا......! ٹرے تمہارے ہاتھوں سے گری تھی۔"

بابا کا لہجہ بے جی سے یکسر مختلف تھا۔

"جی......!"

"پھر تم یہاں کیوں چلی آئیں......؟"

"مجھے ڈر تھا کہیں آپ خفا نہ ہوں۔" اس نے جھوٹ بولا۔

"ارے......! اس میں خفگی کی کیا بات ہے۔ ٹوٹنے والی چیز تھی ٹوٹ گئی۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"اور یہ بے جی کہاں گئیں......؟" احتشام بھائی نے یوں پوچھا جیسے انہیں یقین ہو کہ بے جی یہاں ضرور آئی ہوں گی۔

"پتا نہیں......" اس نے لاعلمی ظاہر کی۔

"کیا وہ ابھی یہاں نہیں آئی تھیں......؟" احتشام بھائی کا انداز مشکوک تھا۔ اس کے باوجود وہ پھر جھوٹ بول گئی۔

"نہیں تو......"

"اچھا چلو ناشتا کرو۔" بابا بات ختم کرنے کی غرض سے بولے پھر جاتے جاتے علی کی طرف متوجہ ہوئے جو بیڈ کے سہارے کھڑا معصوم سا چہرہ اونچا کیے انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بچوں کی خاص طور سے شیر خوار بچوں کی ایک دل موہ لینے والی ایک خاص ادا ہوتی ہے کہ جب کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو وہ بہت معصومیت اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں اور جیسے ہی ان کی طرف دیکھو تو وہ شرما کر مسکراتے ہوئے سر جھکا لیتے ہیں اسی طرح پتھر سے پتھر دل انسان بھی بے اختیار ان کی طرف لپکتا ہے۔ اس وقت علی نے بھی ایسا ہی کیا اور مقابل تو خضر حیات تھے۔ اس کے قریب ہی گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئے۔

"میری جان......!" فرطِ محبت سے اسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"بابا یہ گندا ہو رہا ہے۔" اس نے بڑھ کر علی کو لینا چاہا۔

"ارے......! تو ہم کون سا اچھے ہیں۔" وہ اسے گود میں لیے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ پھر تنبیہی انداز میں کہنے لگے۔

"بچے گندے نہیں ہوتے۔"

"دیکھیے تو بابا یہ حسام سے کتنا ملتا ہے۔" احتشام بھائی بغور علی کو دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"ہاں......! اس عمر میں وہ بالکل ایسا ہی تھا۔" گزرا وقت ایک دم بابا کی آنکھوں میں آ سمایا۔

"ابھی مجھے لگا جیسے وہی میرے سینے میں آ چھپا ہو کل ہی کی تو بات ہے، اسی طرح میں نے

اسے اُٹھایا تھا اور تمہاری بے جی نے کہا، یہ گندا ہو رہا ہے۔" ان کی آواز کا بوجھل پن ماحول میں اتر
آیا تھا۔

○○○

اوائل سردیوں کی گلابی شام تھی۔ وہ علی کو گود میں لے کر پچھلی طرف کے برآمدے میں نکل
گئی۔ فضا میں اتری ہلکی ہلکی سی خنکی بھلی لگ رہی تھی۔ وہ یونہی ٹہلتی ہوئی برآمدے کے ایک سرے
سے دوسرے سرے تک چلی گئی اور جب واپس پلٹی تو نائلہ اسے پکارتی ہوئی آ رہی تھی۔

"تم کب آئیں......؟" اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنا ایک بازو نائلہ کی گردن
میں ڈال دیا۔

"ابھی بس کچھ ہی دیر پہلے اور یہ آپ اکیلی یہاں کیا کر رہی ہیں......؟"

"کچھ نہیں...... آؤ اندر چلو۔" وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو نائلہ نے اس کا ہاتھ پکڑ
لیا۔

"اِدھر نہیں اُدھر...... کیا عاطف سے نہیں ملیں گی......؟"

"ہاں......! کیوں نہیں...... تم چلو میں آتی ہوں۔" اسے بے جی کا خیال آیا تو پس و پیش
کرنے لگی۔

"میں جانتی ہوں پھر آپ نہیں آئیں گی، اس لیے میرے ساتھ چلیں۔" وہ واقعی نہیں جانا
چاہتی تھی۔ لیکن نائلہ زبردستی اسے لیے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ بے جی کے لیے اس کی آمد
غیر متوقع تھی۔ انہوں نے ایسی نظروں سے اس کی طرف دیکھا کہ وہ دروازے کے قریب ہی رک
گئی اور عاطف کے ساتھ بیٹھے آصف جہانگیر نے بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر انجانے میں
اس کی پوزیشن مزید خراب کر دی۔

"مجھے جانے دو۔" اس نے سرگوشی میں نائلہ سے کہا لیکن وہ سنی ان سنی کرتی ہوئی اسے کھینچ
کر آگے لے آئی۔

"یہ رابعہ ہے......" نائلہ نے کہا پھر اسے بٹھانے کے بعد اس کا تفصیلی تعارف کروانے لگی۔
وہ سر جھکائے بیٹھی تھی لیکن اس کا سارا دھیان بے جی کی طرف تھا جن کے ہونٹ بھی شور مچانے لگ
رہے تھے۔

"تم کیوں آئیں......؟ جاؤ یہاں سے......" وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے......! آپ کھڑی کیوں ہو گئیں......؟ بیٹھیں نا......" عاطف کے کہنے پر اس نے

مذرزاشا۔

"میں چائے لے آؤں۔"

"نہیں بھابی......! ہم چائے نہیں پئیں گے۔" عاطف درمیان میں بول پڑا۔ نائلہ نے
اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھایا۔ پھر کہنے لگی۔

"اصل میں اس وقت ہم آصف بھائی کے مہمان ہیں ان کے ساتھ جا رہے تھے۔ یہاں
سے گزر ہوا تو سوچا آپ سب سے ملتے چلیں۔" اس نے یونہی بلا ارادہ آصف کی طرف دیکھا تو
نائلہ ان کا تعارف کروانے لگی۔

"یہ عاطف کے بڑے بھائی ہیں۔"

"صرف بھائی نہیں......" عاطف درمیان میں بول پڑا۔

"میرے ماں باپ بھائی دوست سبھی کچھ ہیں اور آج میں جو کچھ ہوں انہی کی بدولت۔" وہ
کیا کہتی خاموش ہی رہی۔

"رابعہ......! علی کو لے جاؤ۔" بے جی نے کہا تو نائلہ فوراً بول پڑی۔

"کیوں بے جی......! بیٹھنے دیں ناں بھابی کو۔"

"سردی بڑھ رہی ہے اور علی نے کوئی گرم کپڑا نہیں پہنا۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے
اسے جانے کا اشارا کیا اور وہ تو خود بھی جانا چاہ رہی تھی فوراً اٹھ کر کمرے سے نکل گئی...... وہ تو چلی
گئی لیکن اس کا ذکر وہیں رہ گیا جتنی دیر تک نائلہ، عاطف اور آصف جہانگیر بیٹھے، اسی کے بارے
میں باتیں کرتے رہے جو بے جی کو پہلے ناگوار گزریں پھر تشویش کا باعث بنیں، کیونکہ وہ سب
اسے دوبارہ زندگی کی رنگینیوں کی طرف لانے کی باتیں کرنے لگے تھے۔

بے جی اگر چاہتیں تو اسے گھر سے نکال کر سارا قصہ ہی ختم کر دیتیں لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی
تھیں۔ ایک تو وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کی گود میں حسام کا بیٹا بھی تھا جس سے دستبردار ہونے کو بے
جی تیار نہیں تھیں۔ دوسرے وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھیں کیونکہ اپنی روایت پر اڑے رہنا اپنی جگہ، وہ
ماں بھی تھیں کہ اس گھر سے نکل کر اسے کہیں امان نہیں ملے گی۔

آخر اس نے یونہی تو نہیں اپنے باپ کی نسبت ان کے پاس رہنے کو ترجیح دی تھی۔ وہ چاہتی
تھیں کہ وہ یہاں اپنی مرضی سے رکی ہے اور اب بقیہ زندگی ان کی مرضی سے گزارے۔

اور......

خضر حیات تو برسوں پہلے ہی الخضر کا نظام بے جی کے ہاتھوں میں دے کر خود بری الذمہ ہو
گئے تھے۔ انہوں نے کبھی گھر کے معاملات میں دخل نہیں دیا۔ بے جی ہی سیاہ و سفید کی مالک تھیں

اور اب تک وہ ہر معاملے کو بخوبی نپٹاتی آئی تھیں۔ رابعہ کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ بے جی اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ اس کے لیے بھی سوچیں گی اور پھر اتنا زیادہ وقت تو نہیں گزرا تھا ان کے خیال میں۔ وہ کسی مناسب وقت کے انتظار میں تھے لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ یعنی وہ نہ تو خود اس کے لیے سوچنے کو تیار تھیں اور نہ ہی کسی اور کو ایسا کرنے دے رہی تھیں۔

’’حسام اتنی ہی زندگی لے کر آیا تھا۔‘‘ وہ غیر جانب داری سے سوچنے لگے۔

’’اور اب اس کے لیے اس لڑکی رابعہ کو تمام عمر یونہی بٹھائے رکھنا زیادتی ہے اور ہم یقیناً اس کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔‘‘

پھر انہیں احتشام کی بات یاد آئی۔ وہ رابعہ اور انعام کے نکاح کی بات کر رہے تھے۔ خضر حیات نے اس نہج پر سوچا تو انہیں بھی یہی بات مناسب لگی لیکن اب سارا مسئلہ بے جی کو اس بات پر راضی کرنا تھا۔ خضر حیات نے کبھی بے جی کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے کبھی اختلاف کا موقع نہیں دیا تھا اور اب جب زندگی میں پہلی بار یہ موقع آیا تو وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی تلخی پیدا ہو۔ وہ سوچنے لگے کوئی ایسا طریقہ جو بے جی سے الجھے بغیر بات بن جائے۔ اگلے کئی دن انہوں نے بڑی سنجیدگی سے سوچنے میں گزارے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ گھر کا جائزہ بھی لیتے رہے۔ خاص طور سے وہ بے جی کا بغور مشاہدہ کر رہے تھے کہ وہ رابعہ کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں۔ پورے ایک ہفتے میں انہوں نے جو کچھ دیکھا وہ کچھ یوں تھا۔

رابعہ زیادہ اپنے کمرے ہی میں رہتی ہے۔ کھانے کے وقت موجود تو ہوتی ہے لیکن سب کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوتی۔ گھر میں آئے کسی مہمان کے سامنے جانے کی اسے اجازت نہیں۔

ہنسنے پر بھی شاید پابندی ہے جبھی تو ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہو کر جدا ہونا بھول گئے ہیں۔ غرض زندگی اس کے نزدیک صرف آتی جاتی سانسوں کا نام ہے سانس جاری ہے اور وہ زندہ ہے۔ اس سے ہٹ کر زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر اس کا کوئی حق نہیں رہا اور اس حق سے محروم اسے بے جی نے کیا ہے۔ اور بے جی کے مشاہدے سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ دو متضاد کیفیات میں گھری ہوئی ہیں۔ یعنی رابعہ پر زندگی کے راستے تنگ کر کے وہ مطمئن نہیں ہیں جہاں وہ اسے سب کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہونے دیتیں وہاں بعد میں ہدایت کرتی ہیں کہ آرام سے بیٹھ کر کھا لو۔ اس طرح اور بہت سی باتیں کہ وہ اس سے غافل ہو کر بھی غافل نہیں رہتیں۔ یعنی اندر کہیں اس کے لیے نرم گوشہ موجود ہے اور یہی بات خضر حیات کے لیے اطمینان بخش تھی۔ مزید اطمینان کے لیے انہوں نے بے جی کو آزما ڈالا۔

اس رات رابعہ حسب معمول ان کے لیے دودھ سے بھرا گلاس لے کر آئی تو اسے دیکھتے ہی انہوں نے اپنی پیشانی پر بل ڈال لیے اور ناگواری سے پوچھنے لگے۔

’’کوئی اور نہیں ہوتا گھر میں......؟‘‘ لہجہ ایسا تھا کہ جہاں وہ اپنی جگہ رکی وہاں بے جی چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

’’صالحہ بیگم......! یہ ذمہ داری کسی اور کو سونپ دیجیے۔‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘ بے جی بالکل نہیں سمجھیں۔

’’رات آرام و سکون کے لیے ہوتی ہے اور یہ منحوس لڑکی روزانہ اس وقت آ کر میرا سکون برباد کر دیتی ہے۔ میں ڈھنگ سے سو نہیں سکتا۔‘‘

’’کیا......؟‘‘ بے جی پورا منہ کھولے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ خود انہوں نے اگر رابعہ کے لیے سوچی بھی تو اس کے منہ پر کبھی نہیں کہی تھی۔

’’اب خدا کے لیے اس سے کہیں جائے یہاں سے۔‘‘ انہوں نے بیزاری سے کہا تو بے جی اس کی طرف دیکھنے لگیں جو آنکھوں میں اترتے سیلاب کے آگے بند باندھنے میں ناکام ہوئی جا رہی تھی۔

’’تم جاؤ رابعہ......!‘‘ وہ خود کب رکنا چاہتی تھی جیسے ہی بے جی نے کہا وہ فوراً کمرے سے نکل گئی۔ اور اس کے جاتے ہی بے جی کہنے لگیں۔

’’آپ کو رابعہ کے سامنے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔‘‘

’’کیوں......؟ کیا وہ منحوس نہیں ہے......؟‘‘

’’اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اس کے سامنے بھی کہا جائے۔‘‘

’’کیوں اس کے سامنے کہنے میں کیا ہے......؟‘‘

’’نہیں خضر......! اس کی دل آزاری ہوگی۔‘‘

’’دونوں باتیں ایک ساتھ......‘‘ وہ سوچنے لگے۔ ’’منحوس بھی تصور کرتی ہیں اور دل آزاری کا بھی خیال ہے۔‘‘

’’مجھے اس کی پرواہ نہیں۔‘‘ وہ کہنے لگے۔ ’’میں جیسا اس کے بارے میں سوچتا ہوں ویسی بات بھی کروں گا۔‘‘

’’کیا آپ نہیں جانتے کہ کسی کی دل آزاری کرنا کتنا بڑا گناہ ہے۔‘‘

’’جانتا ہوں لیکن میں دوغلا پن بھی اختیار نہیں کر سکتا۔‘‘

اس کے ساتھ ہی وہ تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گئے۔ یہ موضوع ختم کر دینے کا اشارا تھا۔ بے

جی خاموش ہو رہیں اور ان کے چہرے پر رابعہ کے لیے ہمدردی کے جذبات اور سوچ کی گہری لکیریں وہ آنکھوں کی جھریوں سے دیکھتے رہے تھے۔ خضر حیات کو عورت کی نفسیات کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا اور نہ کبھی انہوں نے جاننے کی کوشش کی تھی۔ ویسے بھی وہ اپنی زندگی میں صرف دو عورتوں کے قریب رہے تھے، ایک اپنی والدہ اور دوسری بے جی...... بہن کوئی تھی نہیں اور اولاد کو وہ زیادہ وقت نہیں دے سکے تھے۔ اب یہ اتفاق تھا کہ پہلی بار انہوں نے گھر کے کسی معاملے کو سلجھانا چاہا تو وہ معاملہ صرف عورتوں ہی کا تھا۔ یہاں ایک دلچسپ بات سامنے آئی کہ عورت بذات خود اپنی صنف پر خواہ کتنی ہی زیادتی کرے یا کتنے ہی ستم کیوں نہ توڑے لیکن جب یہی ستم و زیادتی صنف مخالف کی طرف سے ہو تو وہ برداشت نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے رابعہ کے ساتھ اپنا رویہ بالکل ہی تبدیل کر دیا۔

اور رابعہ......

خضر حیات کے کمرے سے آنے کے بعد وہ بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک انہیں کیا ہو گیا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے تو وہ خود اس کے کمرے میں آئے تھے اور نہ صرف بڑی شفقت سے بات کی بلکہ علی کو بھی گود میں اٹھایا تھا۔ پھر اچانک۔ وہ بہت دیر تک اُلجھتی رہی اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ بے جی انہیں اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔

''اب میں یہاں کتنا عرصہ اور رہ سکوں گی۔'' اس نے سوچا۔ پہلے یہ امید تو تھی کہ اگر بے جی نے کوئی ایسا فیصلہ کیا تو بابا انہیں اس پر عمل نہیں کرنے دیں گے۔ اور اب جب کہ وہ خود ان کے ہم خیال ہو گئے ہیں تو اس کے سامنے ڈھال کیسے بنیں گے بھلا۔ گویا جو تھوڑی بہت دل میں امید تھی وہ بھی وقت کے ظالم پنجے نے دبوچ لی تھی۔ اس دن کے بعد سے اس نے بابا کے سامنے جانا ہی چھوڑ دیا، وہ ڈرتی تھی اسے دیکھ کر کہیں ان کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو ابھی بے جی کی صرف سوچ تک ہی محدود تھی۔

○ ○ ○

سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دوپہر میں وہ علی کو سلا کر جلدی جلدی اس کے کپڑے اکٹھے کرنے لگی۔ اس نے سوچا بچے کے اٹھنے سے پہلے دھو کر ڈال دے اور ابھی وہ باتھ روم کی طرف جا ہی رہی تھی کہ صبیحہ ٹیلی فون لیے اس کے کمرے میں آ گئی۔

''بھابی...... ! نائلہ کا فون ہے...... آپ سے بات کرے گی۔''

''اچھا......!'' اس نے کپڑے وہیں رکھ دیے اور آ کر اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔

''میں آصف ہوں۔'' اس کی ہیلو کے جواب میں کہا گیا تو اس نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا اور صبیحہ کو موجود نہ پا کر وہ بے طرح گھبرا گئی۔

''ہیلو رابعہ......!'' آصف اسے متوجہ کر رہے تھے۔ وہ بمشکل اپنے آپ کو سنبھال کر بولنے پر آمادہ ہوئی۔

''نائلہ کہاں ہے......؟''

''نائلہ بھابی...... ! ابھی تو یہیں تھیں۔'' پھر ایک لمحہ توقف کے بولے۔ ''سنیں...... ! میں نائلہ کی اجازت سے آپ سے بات کر رہا ہوں۔''

''ک...... کیا بات......؟'' وہ بہت زیادہ گھبرا رہی تھی۔

''پہلے آپ ریلیکس ہو جائیں۔'' وہ اس کی گھبراہٹ محسوس کر کے کہنے لگے۔

''پلیز...... ! اگر آپ نائلہ کو بلا دیں تو......''

''نائلہ اور عاطف ابھی ابھی باہر نکلے ہیں۔'' انہوں نے اتنا کہا تھا کہ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اور ابھی وہیں کھڑی کچھ قیاس کر رہی تھی کہ صبیحہ دوبارہ اندر آ گئی۔

''کیا کہہ رہی تھی نائلہ......؟'' صبیحہ کے پوچھنے پر اس نے پہلے ٹٹولنے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر کوئی خاص بات نہیں کہہ کر قدم آگے کی طرف بڑھا دیا۔

کچھ دن چپ چاپ اور قدرے سکون سے گزر گئے۔ اس صبح وہ اپنے کمرے میں بیٹھی سب کے اپنے اپنے کام پر روانہ ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اب اس نے یہی معمول بنا لیا تھا کہ جب بابا اور احتشام بھائی آفس کے لیے نکل جاتے اور بے جی اپنے کمرے میں چلی جاتیں تب وہ اپنے کمرے سے نکل کر کچن میں جاتی۔ پہلے علی کے لیے فیڈر اور فارلیک بناتی پھر اپنے لیے ناشتا۔ اس وقت بھی وہ یوں ہی اپنے خیالوں میں بیٹھی تھی کہ اسے پتا بھی نہیں چلا اور علی گھٹنوں کے بل کھسکتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ کمرے کے سامنے بنی گیلری سے ہو کر وہ برآمدے میں جا پہنچا...... کھلی جگہ پر وہ بہت خوش ہوا اور خوشی کا اظہار یوں کیا کہ فرش پر زور سے ہاتھ مار کر آگے بڑھنے لگا۔ پھر ستون کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت بابا اور بے جی اپنے کمرے سے نکلے شاید ناشتے کے لیے ڈائننگ روم کی طرف جا رہے تھے کہ علی کو دیکھ کر وہیں رُک گئے۔ ایسے موقعوں پر انہیں ہمیشہ حسام یاد آیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی دونوں بہت خاموشی سے اسے دیکھنے لگے اور ابھی بے جی اس کی طرف مزید پیش قدمی کرنا ہی چاہتی تھیں کہ احتشام بھائی کا بیٹا رضا سامنے سے بھاگتا ہوا آیا اور ایک ہاتھ سے علی کو گراتا چلا گیا۔ گر کر علی رویا نہیں بلکہ بہت معصومیت سے بھاگتے ہوئے رضا کو دیکھنے لگا۔

"ارے......! وقت یوں بھی پلٹ کر آتا ہے۔" بے جی بے اختیار ہوئیں۔"......یہ تو احتشام اور حسام ہیں۔" پھر بڑھ کر علی گود میں اٹھا لیا۔ اور علی جو گرنے سے نہیں رویا تھا ان کی آغوش میں رونے لگا۔ پتا نہیں اسے اپنی چوٹ کا احساس اب ہوا تھا یا بے جی کی گود اس کے لیے اجنبی تھی۔

اس نے علی کے رونے کی آواز اپنے کمرے میں سنی اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر چلی آئی۔ سامنے بے جی علی کو بازوؤں میں بھینچے بے تحاشا پیار کیے جا رہی تھیں اور وہ رو رہا تھا بابا پر نظر پڑی تو وہ وہیں رُک گئی۔ انہوں نے اسے رُکتے ہوئے کن انکھیوں سے دیکھا پھر بے جی کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ شاید ممتا کا سارا خزانہ اسی وقت لٹانے کے موڈ میں تھیں۔

"شاید آخری ضرب لگانے کا وقت آ گیا ہے۔" انہوں نے سوچا اور ایک دم تیور بدل کر زور سے چلائے۔

"رابعہ لے جاؤ اس بچے کو صبح ہی صبح راستے میں کھڑا ہوا ہے۔"

بے جی حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگیں اور وہ آہستہ قدموں سے آگے بڑھ آئی۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ......!" بے جی نے بچہ اس کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔

"میں اب ان دونوں کا وجود برداشت نہیں کر سکتا انہیں کہیں اور بھیج دیں۔"

"کہاں......کہاں جائے گی یہ......؟"

"کہیں بھی...... یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔" اس کے ساتھ ہی وہ ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کا کہہ کر بغیر ناشتہ کیے آفس کے لیے نکل گئے۔

اپنے تئیں وہ بے جی کو سوچنے کا وقت دے گئے تھے اور خیال تھا جب شام میں واپس آئیں گے تو بے جی احتجاج کریں گی اور اس کے حق کے لیے لڑیں گی۔ جواب میں وہ بڑے رسان سے کہہ دیں گے۔ میں اسے یہاں رہنے کا حق دیتا ہوں آپ اسے ڈھنگ سے زندہ رہنے کا حق دیں۔ اپنے ذہن سے یہ بات نکال دیں کہ وہ بیوہ ہے تو زندگی پر اس کا حق نہیں رہا۔

لیکن رات میں جب بے جی فراغت سے ان کے پاس بیٹھیں تو بڑے آرام سے بتایا۔

"میں نے رابعہ کو علی سمیت پچھلے کوارٹر میں منتقل کر دیا ہے۔"

"کیا......؟" باوجود کوشش کے وہ اپنی حیرت چھپا نہ سکے۔

"آپ ہی نے تو کہا تھا۔" سارا الزام ان کے سر رکھ کر آخر میں کہنے لگیں۔

"مجھے خود اس کا یہاں رہنا کھلتا تھا۔ ہر وقت یہ خوف کہ کہیں اس کی نحوست پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے اور۔" بے جی کہے جا رہی تھیں اور وہ اپنے جال میں خود پھنس کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھے گئے۔

پہلی بار بے جی کے رویے پر گھر میں دبا دبا سا احتجاج جاگا تھا۔ اور اب سب بے جی اور بابا کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

"رابعہ اسی گھر کی فرد ہے۔ اسے وہاں کیوں منتقل کیا......؟" احتشام بھائی کی آواز اونچی تھی۔

"اگر آپ اسے محبت و شفقت نہیں دے سکتے تو آپ اس سے ایسا سلوک کرنے کا حق بھی نہیں رکھتے۔" انعام نے کہا۔

"ہم اس کے ساتھ یہ ناانصافی اور زیادتی برداشت نہیں کر سکتے۔" صبیحہ کہنے لگی۔

"اسے ابھی اسی وقت یہاں لے کر آئیں۔" احتشام بھائی نے کہا۔

"میری آواز ان آوازوں کے ساتھ ہونی چاہیے تھی۔" بابا نے سوچا اور سر جھکا لیا۔

"چلیں بے جی اسے لے کر آئیں۔ وہ ہمارے بھائی کی عزت ہے۔" بابا کو سر جھکاتے دیکھ کر احتشام بھائی بے جی کی طرف متوجہ ہوئے۔

"وہ اپنی مرضی سے وہاں منتقل ہوئی ہے۔" بے جی اطمینان سے بولیں۔ لہجے کا یقین بتا رہا تھا کہ انہوں نے یہی بات رابعہ کو بھی سمجھا دی ہو گی۔

"ہم پوچھتے ہیں رابعہ سے۔" سب ایک ساتھ بولے "پوچھ لو۔ لیکن کیا تم لوگوں کو میری بات کا یقین نہیں ہے؟۔"

"بات یقین کی نہیں ہے۔ ہمیں اس سے پوچھنے دیں کہ وہ وہاں کیوں گئی ہے۔"

"جاؤ اپنی تسلی کر لو۔" وہ سب کمرے سے نکل کر رابعہ کی طرف چل پڑے۔ پچھلے لان کے بائیں طرف آخری سرے پر چار کوارٹر لائن سے بنے تھے۔ صرف ایک میں خانساماں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ باقی تین خالی تھے اور ان خالی کوارٹروں میں سے ایک میں روشنی دیکھ کر وہ سب بے دھڑک اس میں داخل ہو گئے اور وہ ان کی آمد سے بے خبر علی کو تھپکتے ہوئے گنگنا بھی رہی تھی۔ شاید کوئی لوری۔

آ جا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا
منے کو میرے سلا کیوں نہ جا

اس کے ہونٹوں پر مسکان تھی اور چہرے پر اطمینان۔ وہ سب سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے پھر بڑھ کر ایک دم اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

"ارے......!" وہ اُٹھنے لگی کہ صبیحہ نے بڑھ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"آپ علی کو سلا لیں۔"

"یہ سو گیا ہے۔" اس نے علی کو چادر اوڑھائی اور سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"آپ سب کیسے آئے......؟"

"تمہیں یہاں آنے پر بے جی نے مجبور کیا ہے......؟" اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے احتشام بھائی پوچھنے لگے۔

"نہیں تو......"

"پھر......؟"

"میں خود ہی آئی ہوں۔"

"جھوٹ مت بولو رابعہ میں جانتا ہوں بے جی......!"

"بے جی کو الزام نہ دیں احتشام بھائی۔" وہ ان کی بات کاٹ کر فوراً بولی۔

"اصل میں گھر میں آنے جانے والی خواتین مجھے موضوع ضرور بناتی ہیں۔ پھر ترس اور ہمدردی کی آڑ میں کچھ ایسی باتیں بھی ہو جاتی ہیں جو میرے لیے مزید دکھ کا باعث بنتی ہیں اس لیے میں نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔"

"میں گھر میں سب کا داخلہ بند کر دوں گا۔ لیکن تم یہاں نہیں رہو گی۔"

"نہیں بھائی، لوگوں سے کٹ کر نہیں رہا جا سکتا اور ایسی صورت میں تو اور بھی مشکل ہے کہ نہ بے جی کا کوئی ہے اور نہ بابا کا جب کہ اس گھر میں بیاہنے والے ابھی دو فرد ہیں۔ لوگوں کا آنا جانا رہے گا تو کہیں بات بنے گی ناں۔"

"تم......!" وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ وہ بول پڑی۔

"میری فکر نہ کریں۔ میں یہاں بہت آرام سے ہوں اور یقین کریں جب لوگ مجھے موضوع بنانا چھوڑ دیں گے تب میں وہیں آ جاؤں گی۔"

"تو اب تم نہیں چلو گی۔"

"مجھے یہیں رہنے دیں۔" وہ اتنی منت سے بولی کہ احتشام بھائی، انعام اور صبیحہ کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ دونوں کیا کہتے۔ جب وہ ان ہی کی بات نہیں مان رہی تھی۔

"بہر حال...... تم کچھ بھی کہو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم اپنی مرضی سے یہاں نہیں آئیں اور میں اپنے طور پر یہ بات معلوم کر کے رہوں گا۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے انعام اور صبیحہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔ پھر خود ان سے پہلے ہی باہر نکل گئے۔

"آپ انتہائی بزدل خاتون ہیں۔" انعام نے کہا اور صبیحہ کا ہاتھ پکڑ کر احتشام بھائی کے پیچھے چل پڑا۔ وہ کچھ دیر تک ان کے قدموں کی آوازیں سنتی رہی پھر چارپائی سے اتر کر کمرے

نکل آئی چھوٹا سا چوکور آنگن جس کے گرد اس کے قد سے ذرا اونچی چار دیواری تھی اور درمیان میں ایک دروازہ اس نے بڑھ کر دروازہ بند کیا پھر اس سے کمر ٹیک کر کھڑی ہو گئی۔ ذرا سا سر اونچا کر کے دیکھا۔ اوپر کھلا آسمان تھا دور تک پھیلا ہوا، جس کے سینے پر جگمگاتے ستارے اسے اپنا مذاق اڑاتے لگے۔

"تم جھوٹی ہو...... تم جھوٹی ہو۔"

"ہاں......! میں جھوٹی ہوں۔" اس نے دکھ سے اعتراف کیا اس لئے کہ میں نے اپنی زبان بے جی کے پاس دان رکھ دی ہے۔ اس جھوٹی پناہ گاہ کے عوض۔" اس کی آنکھوں میں سیلاب امڈ آیا اور اب بند باندھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس نے شاید صبح ہی سے اپنے آپ کو رونے سے باز رکھا ہوا تھا۔ جانتی تھی ان بہن بھائیوں میں سے کوئی نہ کوئی ادھر ضرور آ نکلے گا۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی روئی روئی سی آنکھیں اس کے جھوٹ کا بھرم رہنے نہ دیں اور اب ایسا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ خوب روئی یہاں تک دل ٹھہر سا گیا۔

"یہاں زندگی بہت دشوار ہوگی۔" بے جی نے کہا تھا۔ شاید بے جی نے وہ دشواریاں نہیں دیکھیں جن سے گزر کر میں یہاں تک آئی ہوں۔ اس نے سوچا تھا اور اب وہ ان دشواریوں میں موازنہ کر رہی تھی۔

ابا کا نشے میں حواس کھو کر چیخنا چلانا، گالیاں پھر امی کو مارنا، فراز کو چھین لینے کی دھمکی اور امی کا ان دونوں بہن بھائی کو چھپاتے خود مٹی میں جا چھپنا اور پھر اس دوسری عورت کا سلوک۔ اس گھر کی کوئی یاد، کوئی ایک لمحہ ایسا نہیں تھا جسے وہ دل کے نہاں خانوں میں چھپا رکھتی کہ کبھی جو عہد رفتہ کو آواز دے تو وہ لمحہ بھاگا چلا آئے اور یہاں کچھ وقت کے لیے ہی سہی قدم قدم پر اس کے لیے چاہت کے موتی بکھرے ضرور تھے۔ اور ایک نہیں بے شمار لمحات جو حاصل زیست تھے جن کے سہارے وہ اپنی عمر تمام کر سکتی تھی اور پھر علی ایک انمول تحفہ، جو شاید قدرت نے اس کی دل بستگی کے سامان کے طور پر اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔

"میں ان راہوں سے بآسانی گزر سکتی ہوں۔" اس نے اپنے آپ کو مطمئن کیا۔

"یہ راستے پرخار ضرور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ پاؤں لہولہان ہو جائیں۔"

علی نیند میں رونے لگا تھا۔ وہ چونکی اور بھاگتی ہوئی اندر گئی۔ اس کے قریب پہنچی تو وہ دوبارہ سو چکا تھا۔

"تو اپنے وقت کا بادشاہ ہے۔" وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکراتی ہوئی بڑبڑائی اور پھر اس

کے برابر لیٹ گئی۔ کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تو زندگی خود بخود معمول پر آگئی۔ ویسے بھی اب اسے ملال سے زیادہ اطمینان تھا کہ خضر حیات نے اسے رہنے کو جگہ تو دی۔ ورنہ اگر وہ اسے گھر سے ہی نکال دیتے تو وہ کیا کر لیتی اور کمال تو یہ تھا کہ اسے اطمینان نصیب ہوا تو خضر حیات کا سارا اطمینان رخصت ہو گیا۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اس طرح ہو جائے گا۔ وہ تو اسے ڈھنگ سے زندہ رہنے کا حق دلانا چاہتے تھے کہ انجانے میں جو تھوڑا بہت حق تھا، وہ بھی چھین گئے۔ انہیں کسی پل قرار نہیں تھا۔ یہی سوچتے رہتے کہ روزِ حشر حسام کو کیا منہ دکھائیں گے کہ وہ ہستی جسے وہ جان سے بڑھ کر عزیز رکھتا تھا، اس کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا۔

''کیا ہی اچھا ہوتا جو میں ہمیشہ کی طرح اب بھی ہر معاملے سے لاتعلق رہتا۔'' آخر میں وہ یہی سوچتے ہوئے اپنے آپ کو ملامت کرتے تھے۔

○○○

نائلہ بڑے دنوں کے بعد آئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح بے جی سے مل کر وہ رابعہ کو پکارتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ جب صبیحہ ایک دم اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''بھابی یہاں نہیں ہیں۔''

''پھر......؟''

''بڑی عزت دی ہے ہمارے ماں باپ نے انہیں۔ آیئے میں آپ کو ان کے پاس لے چلوں۔'' صبیحہ طنزیہ لہجے میں کہتی ہوئی اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارا کر کے چل پڑی۔

''یہاں......!'' کوارٹر کے سامنے رک کر نائلہ زور سے چیخی۔

''جی جناب......! ایک مل اونر کی بہو جو بقول بے جی کے ودھوا ہو چکی ہے، وہ آج کل یہاں قیام پذیر ہے۔''

نائلہ اس حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھی، اور جب اندر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا، تب بھی کتنی دیر تک غیر یقینی کیفیت میں کھڑی رہی تھی۔

''بیٹھو ناں......!'' وہ محبت سے اصرار کرنے لگی۔

''یہاں تو کیا، میں کہیں بھی نہیں بیٹھوں گی۔'' نائلہ وہیں سے پلٹ گئی، اور سیدھی بے جی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''میں جا رہی ہوں بے جی......!''

''ارے......! ابھی تو آئی ہو۔''

''غلطی سے آگئی ہوں، کیونکہ میں نہیں جانتی تھی کہ یہ گھر اب صرف بڑے لوگوں کا گھر رہ گیا ہے۔''

''کیا مطلب......؟''

''مطلب بھی مجھ سے پوچھیں گی بے جی......!'' وہ تلخی سے ہنسی۔ ''جب ڈاکٹر حسام کی بیوہ یہاں نہیں رہ سکتی تو میں۔''

''نائلہ......!'' بے جی نے ٹوک دیا۔ ''وہ اپنی مرضی سے وہاں گئی ہے۔''

''میں پھر بھی آپ کی اس بات کا یقین نہیں کروں گی۔'' زندگی میں پہلی بار اس کی آواز بے جی کے سامنے اُونچی ہوگئی۔

''مت کرو میرا یقین...... اسی سے جا کر پوچھ لو۔''

''اس سے کیا پوچھوں۔ وہ تو وہی کہے گی جو آپ نے اس سے کہنے کے لیے کہا ہوگا۔''

''نائلہ......!'' بے جی کو غصہ آگیا۔ لیکن اس نے پرواہ نہیں کی۔

''آپ نے اپنا اعتبار، اپنا وقار کھو دیا ہے بے جی۔ میں یہاں ایک پل نہیں رک سکتی۔'' وہ جانے کے لیے پلٹ گئی۔ پھر دروازے میں رک کر بولی۔

''کبھی رابعہ کی جگہ مجھے یا صبیحہ کو بھی رکھ کر سوچ لیجیے گا۔''

بے جی کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر چلا گیا۔ جبکہ وہ پیر پٹختی ہوئی باہر نکلتی چلی گئی تھی۔ وہ بے جی کے لیے سوچوں کے در کھول گئی تھی، جن میں قدم رکھتے ہی وہ بڑی دور تک نکل گئی۔ گو کہ انہوں نے بہت کوشش کی تھی، کہ قدم وہیں رکیں، جہاں رابعہ تھی، لیکن ہر بات جیسے اختیار سے باہر ہوگئی۔ جہاں قدم رکے، جہاں دستک کو ہاتھ بڑھا۔ وہ دروازہ ہی اور تھا، جس نے کھلتے ہی انہیں اندر گھسیٹ لیا، اور ایسی بھول بھلیوں میں لا پٹخا۔ کہ وہ الجھتی چلی گئی تھیں۔

ماتا جی، پتا جی، راجیش بھیا اور ایک وہ چہرہ جو اچانک ہی ذہن کے کینوس پر ابھر آیا تھا۔ بوسیدہ سی ساڑھی میں لپٹی ہوئی رمنا موسی جن کی سانولی رنگت میں زردیاں گھلی تھیں۔ پپڑی زدہ ہونٹ ایک دوسرے پر یوں جمے رہتے جیسے کسی نے سی دیے ہوں۔ بڑی بڑی آنکھیں کہ جنہیں دیکھ کر دشت کی ویرانی کا خیال آئے۔

''موسی......!'' بوسیدہ ساڑھی کا آنچل کھینچ کر اسے متوجہ کرتی ہوئی چھوٹی سی پوجا۔

''تپتے آنگن میں ننگے پیر چلتی ہو، تمہارے پیر نہیں جلتے......؟'' موسی کا سر نفی میں ہلتا۔

''کیوں موسی......!''

"جب من جلتا ہو تو کسی اور جلن کا احساس نہیں ہوتا۔"

"تمہارا من کیوں جلتا ہے......؟" وہ معصومیت سے پوچھتی۔

"تم کیا جانو گی۔"

"تم بتاؤ ناں۔" وہ اصرار کرتی۔

"جب بڑی ہو گی تو خود ہی جان جاؤ گی۔" اور بڑے ہو کر اس نے جانا کہ موہن کی چتا میں لگی آگ موسی کے من میں دہکتی ہے تبھی تو من جلتا ہے۔

"موسی......!" اس نے بڑے ہو کر پوچھا تھا۔ "تم نے من کی آگ بجھانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔"

"کس کے لیے بجھاتی۔"

"کسی کے لیے بھی۔" اس نے ٹپٹا کر یونہی کہہ دیا تھا۔

"پگلی......! یہ آگ بجھائی نہیں جاتی۔" پھر دور خلاؤں میں تکتے ہوئے بولی تھیں۔

"موہن کے بنا جیون میں، رہا ہی کیا۔ وہی تو میرا ہار سنگھار تھا۔ بھاگوان ہوتی ہے وہ پتنی جس کی چتا میں پتی خود آگ لگائے اور اگر جو اس کے برعکس ہو جائے تو پتی کی چتا میں لگی آگ پتنی کو اپنے من میں سلگا لینی چاہیے، اسی میں اس کی شانتی ہے۔"

"کیوں موسی......؟"

"ارے تو تو نادان ہے ری...... بھلا بتا تو موہن کے بنا میں ہار سنگھار کرتی اچھی لگوں گی کیا؟" اور نفی میں سرہلاتے ہوئے اس کے ذہن میں یہ بات "پتی کے بغیر پتنی کا زندگی پر کوئی حق نہیں۔" کچھ اس طرح نقش ہوئی کہ بدلتے وقت اور بدلتے حالات بھی اسے دھندلانے میں ناکام رہے۔ گو کہ اب وہ اس طرح نہیں سوچتی تھیں اب سوچنے کا انداز یوں تھا۔

"کیا رابعہ کا دل چاہے گا کہ وہ حسام کے بغیر اچھی زندگی گزارے......؟"

"کیا اس کے بغیر وہ خوشیوں میں شریک ہونے کا تصور کر سکتی ہے......؟"

"نہیں......! جب وہی نہیں رہا تو وہ کس طرح خوش ہو سکتی ہے......؟"

یہ تو وہی بات ہوئی کہ کوئی آرام سے کہہ دے یہاں سے چلے جاؤ یا سختی سے کہہ دے دفع ہو جاؤ، تو بات وہی ہو گی، صرف انداز بدلے گا۔ یہاں بھی بنیادی سوچ وہی تھی صرف انداز بدلا تھا۔

○○○

دوپہر میں وہ علی کو سلانے کے لیے لیٹی تو اسے خود بھی نیند آ گئی حالانکہ وہ اس وقت نہیں سوتی تھی، اور ابھی دوپہر پوری طرح ڈھلی بھی نہیں تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس بے وقت کے سونے نے سر بھاری کر دیا تھا، اور طبیعت بوجھل ہو گئی تھی، اس نے سوچا، چائے پینے سے شاید سر کا بھاری پن دور ہو جائے۔ علی کو دیکھا، وہ بے خبر سو رہا تھا۔ وہ بہت آہستگی سے اٹھ کر کمرے سے نکلی اور کچن میں آ کر چائے بنانے لگی۔ جب تک پانی کھولتا، اس نے منہ ہاتھ دھو لیا۔ پھر ابھی وہ کپ میں چائے انڈیل ہی رہی تھی کہ علی کی زوردار چیخ سے کیتلی اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ گرم گرم قہوہ اس کے ہاتھ اور پاؤں کو جلا گیا۔ اپنی تکلیف بھول کر وہ اندر بھاگی۔ علی سوتے میں چارپائی سے نیچے گر گیا تھا اور فرش پر اوندھا لیٹا بری طرح رو رہا تھا۔ اس نے بھاگ کر علی کو اٹھایا اور اپنے سینے میں چھپا لیا۔ اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی لیکن وہ جتنا اسے تھپکتی، وہ اتنا زیادہ روئے جا رہا تھا۔

"علی......! علی......!" اسے پکارتے ہوئے بازوؤں میں لے کر اونچا کیا تو دھک سے رہ گئی۔ اس کی پیشانی سے خون بہتا ہوا پورے چہرے پر پھیل گیا تھا۔ فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے، بس اسی طرح اسے لیے ہوئے بے جی کے پاس بھاگی۔ بے جی برآمدے میں بیٹھی تھیں، اور اپنی پریشانی میں اس نے دیکھا ہی نہیں کہ بے جی کے پاس بیٹھے آصف جہانگیر اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے تھے۔

"بے جی......! علی سوتے میں گر گیا ہے۔" بے جی کی نظر علی پر پڑی تو وہ بھی پریشان ہو گئیں اور بڑھ کر اسے لینا چاہتی تھیں کہ آصف نے روک دیا۔

"میں انہیں کلینک لے جاتا ہوں۔" انہوں نے جیب سے رومال نکال کر علی کی پیشانی پر رکھ دیا۔ پھر اجازت طلب نظروں سے بے جی کی طرف دیکھنے لگے۔

"جاؤ......!" بے جی نے رابعہ سے کہا تو وہ اسی طرح آصف کے پیچھے چل پڑی۔ تمام راستے علی کا رونا جاری رہا۔ وہ پریشان ہوتی رہی اور وہ اسے حوصلہ دیتے رہے۔ کلینک کے سامنے گاڑی روک کر جب وہ اترے تو اس کی گود سے علی کو لے لیا۔

"کیا ہوا ڈاکٹر صاحب......!" سسٹر انہیں دیکھ کر بھاگی آئی۔ وہ رابعہ کو وہیں رکنے کا کہہ کر علی کو لیے ہوئے ڈریسنگ روم میں چلے گئے۔ کچھ دیر تک وہ کھڑی علی کے رونے کی آواز سنتی رہی۔ جب وہ چپ ہو گیا تب وہ طویل سانس لیتے ہوئے وہیں بینچ پر بیٹھ گئی۔ دیوار سے سر ٹکایا تو نظریں سامنے کی دیوار پر فاصلے سے لگے کیلنڈر پر بھٹکنے لگیں۔ گول مٹول بچہ اور نیچے لکھا 'آسٹر ملک' پھر بچے کے لیے بہترین غذا ماں کا دودھ۔ نظریں آگے بڑھیں تو فوری توانائی کے لیے گلیکوز ڈی اور آگے تمباکو نوشی صحت کے مضر ہے۔ اس کے بعد دروازہ اور دروازہ کی پیشانی

پر لکھا ڈاکٹر آصف جہانگیر۔

''ڈاکٹر آصف جہانگیر......!'' ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی، اور سماعتوں سے ان کی آواز ٹکرائی۔

''ارے......! آپ یہاں بیٹھی ہیں۔'' وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی، پھر فوراً اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''علی کہاں ہے......؟''

''سسٹر کے پاس ہے، آپ آیئے میرے ساتھ۔'' انہوں نے اس کمرے کی طرف اشارہ کیا جس کے دروازے پر وہ ان کا نام دیکھ رہی تھی۔

''میں علی کو دیکھ لوں۔''

''آپ کو دیکھ کر وہ مچل جائے گا۔ پھر سسٹر کو ڈریسنگ کرنے میں دشواری ہوگی۔'' اس نے کچھ دیر سوچا، پھر ان کے ساتھ ان کے کمرے میں آگئی۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے سب ٹھیک ہے۔'' اسے بیٹھنے کا اشارا کرتے ہوئے انہوں نے اس انداز سے کہا، جو ڈاکٹروں کا مریضوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔

''چائے یا......'' اپنی کرسی پر بیٹھے تو پوچھنے لگے۔

''نہیں شکریہ......!'' اس کا سارا دھیان علی کی طرف تھا۔

''چائے پی لیں، اعصاب پرسکون ہو جائیں گے۔''

اس کا جواب سنے بغیر انہوں نے بیل بجادی۔ ملازم کے آنے پر اسے چائے کے لیے کہا، پھر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ پہلے پریشان تھی، اب نروس بھی لگ رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس کی طرف دیکھنے سے باز رکھتے رکھتے بھی اس کا تفصیلی جائزہ لے گئے۔ اچھی تو وہ پہلے ہی روز لگی تھی، اور اب دل چاہ رہا تھا۔ اس کی سیدھی شفاف مانگ کو ڈھیر سارے ستاروں سے سجادیں۔

ملازم چائے لے آیا تو انہوں نے پوری ٹرے اس کی طرف کھسکا دی، اور خود لاتعلق نظر آنے لگے، پھر جب اس نے کپ ان کی طرف بڑھایا تب وہ متوجہ ہوئے اور اس کے ہاتھ پر نظر پڑی تو پوچھنے لگے۔

''آپ کا ہاتھ کیسے جلا......؟''

''چائے سے......''

''ابھی......''

''نہیں گھر میں۔'' مختصر جواب دے کر اس نے اپنا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ کچھ

دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہے پھر اٹھ کر الماری سے ایک ٹیوب نکال لائے۔

''لایئے......! ٹیوب لگا دوں۔''

''نہیں...... بس ٹھیک ہے۔''

''ٹھیک نہیں ہے۔ ہاتھ اِدھر لایئے۔'' انہوں نے قدرے رعب سے کہا تو اس نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا، اور اپنے ہاتھ کی پشت کو خود دیکھنے لگی۔ شاید سوچ رہی تھی، کہ اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھائے یا نہیں۔ اچانک جلن کا احساس ہونے لگا۔ تو اس نے مٹھی بند کر لی۔

''اس طرح تکلیف کم نہیں ہوگی۔'' انہوں نے کہا، پھر اس کی کلائی تھام لی۔ پہلے روئی بھگو کر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ صاف کیا، پھر اسی نرمی سے ٹیوب لگانے لگے۔

''بینڈیج کردوں......؟'' وہ قریب ہی کھڑے اس کے ہاتھ پر جھکے ہوئے تھے، اور انگلی کی مدد سے ٹیوب پوری جلد پر پھیلاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہی لہجہ، وہی انداز جیسے اس نے کہا تھا۔ ''ڈرپ لگا دوں۔''

''نہیں...... میں مسلسل لیٹے لیٹے تھک جاتی ہوں۔'' وہ بے اختیار کہہ گئی۔

''ارے......!'' وہ ہنسے۔ ''یہ تو بس دو منٹ کا کام ہے۔ اور لیٹنے کی ضرورت بھی نہیں۔ بس یہیں بیٹھیے۔''

''سوری......! میں کچھ غلط کہہ گئی۔'' وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی۔ اور ان کے ہاتھوں میں سے اپنا ہاتھ نکال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ چائے پی لیں۔ میں آپ کے بیٹے کو دیکھتا ہوں۔''

وہ جان بوجھ کر اسے وہیں چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے۔ اسے واقعی چائے کی بڑی شدید خواہش تھی۔ اس کے باوجود اس نے کپ کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور ان کے پیچھے جانے کو تھی کہ وہ علی کو لے کر آ گئے۔

''چلیں......!'' علی کو ان کی گود سے لیتے ہوئے، وہ فوراً جانے کی بات کرنے لگی۔

روکنے کا نہ کوئی اختیار تھا نہ کوئی حق لیکن خواہش ضرور تھی کہ کچھ وقت ان کے سامنے بیٹھے کچھ نہ کہے لیکن سنے اور پھر سوچنے پر آمادہ ضرور ہو، اور اپنی خواہش کی تکمیل انہوں نے یوں کی کہ واپسی میں اپنے گھر لے آئے۔

''ارے......!'' نائلہ اسے دیکھ کر زور سے چیخی، انداز میں حیرت اور خوشی تھی، جبکہ وہ اپنے آپ میں بڑا عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔

''یہ آپ دونوں ماں بیٹے کو کیا ہوا......؟'' نائلہ نے علی کی پیشانی اور اس کے ہاتھ کی طرف

اشارہ کیا۔

''نائلہ......!'' آصف نے ٹوکا۔ ''میرا خیال ہے پہلے انہیں بٹھانے کی بات کرو۔''

''سوری......!'' نائلہ شرمندہ ہوئی، پھر اسے لیے ہوئے اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔

''نائلہ......! مجھے فوراً واپس چھوڑ آؤ۔'' وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی کہنے لگی۔

''کیوں......؟''

''بے جی کو پتا چلا تو......''

''آپ بے جی سے کہہ کر نہیں آئیں۔''

''نہیں...... یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ......''

''ارے ہاں......!'' نائلہ درمیان میں بول پڑی۔ ''آخر یہ سب ہوا کیسے......؟'' اس نے علی کے گرنے کا بتایا اور آخر میں کہنے لگی۔

''اتفاق سے بے جی کے پاس ڈاکٹر آصف موجود تھے، وہ ہمیں اپنے کلینک لے گئے۔ علی کی بینڈیج کی اور پھر گھر لے جانے کی بجائے یہاں لے آئے۔''

''یہ بھی گھر ہی ہے۔'' نائلہ نے پوری بات سن کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''گھر تو ہے لیکن بے جی انتظار میں ہوں گی۔''

''میں انہیں فون کر دیتی ہوں کہ آپ یہاں میرے پاس ہیں اور بمعہ علی کے خیریت سے ہیں۔''

''نہیں نائلہ پلیز......! تم بے جی کو جانتی تو ہو۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''بے جی نے آپ کے ساتھ بہت غلط کیا ہے۔ میں خود آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔''

''انہیں الزام نہ دو۔ اپنے لیے یہ راستہ میں نے خود منتخب کیا ہے، ورنہ انہوں نے مجھے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔''

''کیا کوشش کی تھی، کیا انہوں نے آپ کو بتایا تھا کہ۔'' نائلہ کی بات ہونٹوں میں رہ گئی کیونکہ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر آصف جہانگیر اندر چلے آئے، ان کے پیچھے ملازم ٹرالی دھکیلتا ہوا آرہا تھا۔

''ارے......!'' نائلہ کو ایک بار پھر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ ''میں ابھی آ ہی رہی تھی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' انہوں نے ملازم کو جانے کا اشارہ کیا، اور ٹرالی کھینچ کر نائلہ کے سامنے کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ''کلینک میں انہوں نے چائے یونہی چھوڑ دی تھی، اس لیے میں انہیں یہاں لے آیا۔''

''صرف چائے پلانے۔'' نائلہ ان کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرائی تو وہ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے، جو نائلہ کی شریر مسکراہٹ دیکھتے ہوئے بھی لاتعلق سی بیٹھی تھی۔

''پتا ہے رابعہ......!'' نائلہ نے اسے نام سے مخاطب کیا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں شاید سرزنش بھی تھی۔ جسے نظر انداز کرتے ہوئے نائلہ اپنی کہے گئی۔

''آصف بھائی مجھے بہت گائیڈ کرتے ہیں۔ تم تو جانتی ہو، گھر کے معاملوں میں، میں بالکل مفزری ہوں۔ ابھی بھی مجھے خیال نہیں آیا چائے کا۔ لیکن آصف بھائی۔''

''آہستہ آہستہ سب کچھ سیکھ جاؤ گی۔'' آصف نے کہا، اور چائے کا کپ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''لیجیے...... نائلہ کے آسرے پر رہیں تو یہ چائے ٹھنڈی کر کے ہی آپ کو دے گی۔'' اس نے خاموشی سے کپ تھام لیا۔ پھر ابھی یہ تینوں چائے پی ہی رہے تھے کہ عاطف آگیا۔ اس کے ساتھ جانے کون تھا۔ جو رابعہ کو دیکھ کر دروازے ہی میں رک گیا۔

''آؤ بھئی...... رُک کیوں گئے......؟ نائلہ نے اسے بلایا، پھر رابعہ سے کہنے لگی۔

''رابعہ......! یہ فراز ہے عاطف کا کزن۔ ابھی حال ہی میں یونیورسٹی میں اس کا تقرر ہوا ہے۔ مبیرہ سے اس کے بارے میں پوچھنا۔ وہ اس کی اسٹوڈنٹ ہے۔''

پھر سرگوشی میں بولی۔ ''آصف بھائی اسی کے سلسلے میں بے جی کے پاس گئے ہوئے تھے۔ مبیرہ کے لیے۔''

''وہ ایک دم سر اٹھا کر فراز کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اس نے سر ہلا کر جواب دیا۔

''اور فراز، رابعہ کا تعارف کچھ یوں ہے کہ یہ پہلے بھی میری بھابی تھی اور آئندہ بھی میری بھابی ہوگی۔''

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے نائلہ نے آصف کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اتنی ناداں نہیں تھی۔ اس کا مطلب سمجھ کر زرد پڑ گئی اور اس کے رنگ بدلتے چہرے نے آصف جہانگیر کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں کھینچ دی تھیں۔

''نائلہ......! اب میں چلوں گی۔'' اس نے خالی کپ ٹرے میں رکھا اور کسی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سوئے ہوئے علی کو اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔

''ارے...... آپ تو واقعی جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔'' عاطف حیران ہوا پھر کہنے لگا۔

''اطمینان سے بیٹھیں۔ میں اور نائلہ آپ کو چھوڑ آئیں گے۔''

''میں پھر بھی آجاؤں گی۔ ابھی بے جی علی کے لیے پریشان ہو رہی ہوں گی، اس لیے مجھے جانے دیں۔''

''یہ آپ کا بچہ ہے......؟'' کوئی بات تو تھی کہ فراز بے اختیار ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

''جی......!''

اسی بے اختیاری سے اس نے بھی علی کو اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس کے ہاتھوں سے لیتے ہی فراز نے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھے گئی۔ اس کے بازوؤں میں اس کا بچہ اسی سکون سے سو رہا تھا۔ اسے کسی انجانے احساس نے آگھیرا۔ جیسے علی کی جگہ وہ خود اتنی چھوٹی سی ہو گئی ہو۔ اور......اور......وہ گھبرا گئی، اور پلٹ کر نائلہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔

''کیوں عاطف......! چلیں رابعہ کو چھوڑنے۔'' نائلہ، عاطف سے پوچھنے لگی۔

عاطف اُٹھا، پھر فراز کو رکنے کا کہہ کر ان سے پہلے ہی کمرے سے نکل گیا۔ اس نے فراز کی گود سے علی کو لیا اور قدم بڑھانے سے پہلے بولی۔

''ڈاکٹر آصف......! آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے۔'' انہوں نے ایک دم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، جس سے وہ اپنی بات پوری نہ کر سکی، اور جلدی سے باہر نکل آئی، نائلہ کا خیال تھا وہ اسے گھر کے سامنے چھوڑ کر واپس چلی آئے گی۔ لیکن وہ بے جی سے کچھ اتنی خوفزدہ تھی کہ اس کا خیال کر کے نائلہ کو اس کے ساتھ اندر جانا پڑا۔ بے جی اور بابا کے ساتھ احتشام بھائی اور صائمہ بھابی بھی برآمدے ہی میں موجود تھے۔ نائلہ سلام کے بعد بغیر تمہید باندھے کہنے لگی۔

''رابعہ کو آنے میں دیر اس لیے ہوئی کہ میں اسے اپنے گھر لے گئی تھی۔''

''تم......!'' بے جی نے اتنا کہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

''میں اس وقت کلینک میں تھی۔ جب رابعہ اور علی آصف بھائی کے ساتھ آئے۔ اچھا اب میں چلوں گی۔''

''بیٹھو گی نہیں......؟'' صائمہ بھابی پوچھنے لگیں۔

''نہیں بھابی......! باہر عاطف انتظار کر رہے ہیں۔''

''کیا مطلب......؟ عاطف اندر کیوں نہیں آیا......؟'' احتشام بھائی اُٹھنے لگے تو اس نے روک دیا۔

''ہم صرف رابعہ کو چھوڑنے آئے تھے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ پلٹ گئی۔ سب نے اسے جاتے ہوئے حیرت سے دیکھا جبکہ بے جی اچھی طرح جان رہی تھیں کہ وہ اس طرح کیوں چلی گئی

......؟'' احتشام بھائی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''آؤ بیٹھو رابعہ......! اب علی کیسا ہے

ٹھیک ہے۔'' وہ آہستہ آواز میں کہہ کر کن انکھیوں سے بابا کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اس نے سوچا اس سے پہلے کہ وہ اسے یہاں سے جانے کا کہیں، اسے خود ہی چلے جانا چاہیے......اور وہ اسی طرح خاموشی سے وہاں سے چلی آئی۔

اپنی چھوٹی سی پناہ گاہ میں قدم رکھا تو بے تحاشا حیرت نے آن گھیرا، کمرے میں کارپٹ بچھا تھا اور چارپائی کی جگہ ڈبل بیڈ۔ پہلے اسے شبہ ہوا کہیں وہ کسی دوسرے کوارٹر میں تو نہیں داخل ہو گئی۔ لیکن بقیہ چیزیں اس کے شبے کی نفی کر رہی تھیں۔

''واہ بے جی......! آپ کا بھی جواب نہیں۔ زخم بھی لگاتی ہیں اور مرہم بھی خود ہی رکھتی رہتی ہیں، جب صبیحہ اس کے پاس آئی۔ آتے ہی کہنے لگی۔

''مجھے ابھی معلوم ہوا کہ علی کو کوئی چوٹ وغیرہ لگی ہے۔''

''ہاں......! اب ٹھیک ہے، آؤ بیٹھو۔'' اس نے ٹانگیں سمیٹ کر اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو اس نے پہلے جھک کر علی کو پیار کیا پھر آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''شام میں نائلہ باجی آئی تھیں۔ مجھ سے ملے بغیر ہی چلی گئیں۔''

''وہ مجھے چھوڑنے آئی تھی۔'' پھر اس نے بتایا کہ وہ نائلہ کے گھر گئی تھی۔ آخر میں شرارت سے کہنے لگی۔

''سنو......! وہاں فراز بھی تھا......؟''

''کون فراز......؟'' صبیحہ کے انجان بننے پر وہ ہنس پڑی۔

''تم نہیں جانتیں، جبکہ نائلہ نے تو مجھ سے کہا تھا کہ میں فراز کے بارے میں تم سے پوچھ لوں کیونکہ تم اس کی اسٹوڈنٹ ہو۔''

''اسٹوڈنٹ تو ہوں۔ لیکن ان کے بارے میں زیادہ جانتی نہیں ہوں۔''

''تو میں کون سا تم سے ان کا شجرۂ نسب پوچھ رہی ہوں۔''

''پھر......؟''

''صرف اتنا بتا دو، کیسا ہے......؟''

''آپ مل تو آئی ہیں، پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں۔'' صبیحہ مسلسل دامن بچا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

''گویا تم اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتیں۔''

"ارے نہیں بھابی......! کوئی بات ہو تو کروں! اور یہ آپ جا کہاں رہی ہیں......؟"

"چائے بنانے۔"

"چائے پینے کو واقعی دل چاہ رہا ہے لیکن آپ بیٹھیں۔ میں بنالاتی ہوں۔" صبیحہ اٹھنے لگی تو اس نے روک دیا۔

"تم علی کے پاس بیٹھو۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔" وہ کمرے سے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد چائے لے کر آئی تو صبیحہ علی کے ساتھ لیٹی اسے آہستہ آہستہ تھپک رہی تھی۔

"یہ اُٹھ گیا تھا......؟" وہ پوچھنے لگی۔

"اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن میں نے دوبارہ سلا دیا۔" صبیحہ اٹھ کر بیٹھی پھر اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا۔

"بھابی......!" چائے کے دو تین سپ لینے کے بعد وہ کہنے لگی۔ "میں واقعی فراز کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔"

"پگلی......! میں نے تمہاری بات کا یقین کر لیا تھا۔" وہ اس کا ہاتھ دبا کر محبت سے بولی۔

"اگر آپ یہ پوچھنا چاہتی تھیں کہ میرا اس کے بارے میں کیا خیال ہے تو بڑا نیک خیال ہے۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے، اور میرا خیال ہے، وہ بھی مجھے ناپسند نہیں کرتا لیکن۔" وہ خاموش ہو کر جانے کیا سوچنے لگی۔

"لیکن کیا......؟"

"لیکن بھابی......! میرے یا...... اس کے پسند کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہوگا تو وہی جو بے جی چاہیں گی۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"مجھے فراز اچھا ضرور لگتا ہے لیکن میں نے اس کے حوالے سے خواب نہیں سجائے۔ اس لیے کہ بے جی کا کوئی پتا نہیں، کب کس بات پر اڑ جائیں اور میں تو نائلہ باجی کے مقابلے میں بہت بزدل ہوں، جب وہ اپنے حق کے لیے نہیں لڑ سکی تھیں تو میں تو......"

"بھابی......!" انعام پکارتا ہوا آ رہا تھا۔ صبیحہ ایک دم خاموش ہو گئی، اور اسے بھی اس موضوع کو یہیں ختم کر دینے کا اشارا کیا۔

پھر کتنی دیر تک وہ دونوں بہن بھائی اس کے پاس بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے تھے۔ اور جب وہ اٹھ کر گئے تو اسے بھی نیند آنے لگی، اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور آ کر علی کے برابر لیٹ گئی۔ پھر بس کچھ دیر کو ہی اس کا ذہن بھٹکا تھا کہ نیند غالب آ گئی۔

صبح علی کو بخار بھی ہو گیا۔ شاید چوٹ اور پھر تکلیف کی وجہ سے اس کا بدن گرم ہو گیا تھا۔

پریشان ہو گئی لیکن فوری طور پر بے جی کے پاس جانے کی جرات نہ کر سکی۔ شاید اندر کہیں یہ خوف تھا کہ وہ کل نائلہ کے گھر جانے کی تفصیل معلوم کریں گی۔ اور چھپاتے چھپاتے بھی سب کچھ صاف صاف کہہ دے گی۔ جبکہ نائلہ نے ان سے کہا تھا کہ وہ خود اسے اپنے گھر لے گئی تھی۔ اس کے پاس کچھ میڈیسن رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے کال پول...... تلاش کر کے اسی میں سے ایک چمچ علی کو پلا دیا اور سوچا اگر اس سے بخار نہ اترا تب پھر بے جی سے کہے گی۔ گیارہ بجے کا وقت ہو گا۔ وہ علی کے کپڑے دھو کر ڈال رہی تھی، جب ملازمہ نے آ کر اسے ڈاکٹر آصف کے آنے کی اطلاع دی اور کہا وہ یہیں دروازے پر کھڑے ہیں۔

"کیا......؟ وہ گھبرا گئی۔" تم انہیں بے جی کے پاس کیوں نہیں لے گئیں......؟"

"وہ تو جی صائمہ بی بی کے ساتھ ان کے میکے گئی ہوئی ہیں۔"

"گھر میں اور کوئی نہیں ہے......؟"

"نہیں......اور ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے۔ وہ علی کو دیکھنے آئے ہیں۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کرے، عجیب صورت حال تھی۔ اندر بلانا بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا، اور دروازے سے لوٹانا تو انتہائی غیر اخلاقی حرکت تھی۔

"پتا نہیں، وہ اسے اس کوارٹر میں دیکھ کر کیا سوچیں۔" اس نے سوچا اور ملازمہ کو کوئی جواب دیے بغیر کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے ڈاکٹر آصف کو کمرے کے دروازے میں کھڑا دیکھا۔ وہ شاید اندر آنے کی اجازت طلب کر رہے تھے۔ وہ بس ذرا سا سر ہلا سکی۔

"کیسا ہے آپ کا بیٹا......؟" وہ آتے ہی علی پر جھک گئے۔ کچھ دیر تک اسے چیک کرنے کے بعد جب سیدھے کھڑے ہوئے تو کہنے لگے۔

"اسے تو بخار بھی ہو رہا ہے۔"

"جی......!"

"کب......رات میں ہی بخار ہو گیا تھا......؟"

"نہیں......رات تو یہ آرام سے سو یا رہا۔ صبح میں نے دیکھا۔ اس کا بدن گرم تھا۔"

"کوئی میڈیسن دی......؟" وہ اس وقت خالص ڈاکٹری لہجے میں بات کر رہے تھے۔

"جی......! میرے پاس کال پول تھی وہی دے دی۔"

"اچھا......!" انہوں نے کاغذ پر مزید میڈیسن لکھ کر کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا، پھر کہنے لگے۔

"زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ یہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔" پھر بغور اس کی طرف دیکھ کر

بولے۔ ''میرا خیال ہے آپ کو بھی میڈیسن کی ضرورت ہے۔''

''مجھے......'' وہ اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''علی سے زیادہ تو آپ بیمار لگ رہی ہیں۔''

''میں علی ہی کی وجہ سے پریشان ہوں۔''

''اس کے بارے میں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، کہ یہ شام تک ہنستا کھیلتا نظر آئے گا۔ اس کی چوٹ بھی معمولی ہے۔ مزید ڈریسنگ کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ خاموش رہی تو کہنے لگے۔

''بچوں کو چوٹیں لگتی رہتی ہیں، اور وہ بیمار بھی ہو جاتے ہیں، لیکن بچے کی ماں کو ذرا حوصلے سے کام لینا چاہیے۔ ورنہ صحیح دیکھ بھال نہیں ہو سکے گی۔''

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ جلدی سے کہہ گئی۔

''اچھا......!'' وہ بے ساختہ مسکراہٹ کو روک نہ پائے۔

''آپ بیٹھیں ڈاکٹر آصف! میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔'' بڑی دیر بعد اسے خیال آیا۔ تو وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔

''چائے پھر سہی......'' انہوں نے انکار نہیں کیا، گویا دوبارہ آنے کا ارادہ تھا کہنے لگے ''میں اس وقت کلینک جا رہا تھا۔ سوچا پہلے آپ کے بیٹے کو دیکھ لوں۔'' (تمہیں دیکھنے کی خواہش بھی شدید تھی۔)

''شکریہ......!''

''ویسے نائلہ نے بھی بار بار تاکید کی تھی کہ میں یہاں سے ہوتا ہوا جاؤں۔ او کے اب میں چلوں۔'' انہوں نے قدم بڑھائے تو وہ سر جھکائے ہوئے کچھ سوچتی ہوئی ان کے پیچھے چل پڑی۔

''میں شام میں پھر آؤں گا۔'' وہ دروازے کے قریب قدم روک کر ایک دم اس کی طرف پلٹ کر بولے، تو وہ بے حد خاموش نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''علی کو دیکھنے۔'' اس وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن وہ کر گئے۔

''ڈاکٹر آصف......!'' وہ پلٹے تو اس نے پکار لیا۔ ''اگر آپ خیال نہ کریں تو ایک بات کہوں۔''

''ضرور......!''

''آپ یہاں آنے سے پہلے بے جی سے اجازت ضرور لے لیجیے گا۔''

اپنی بات کہہ کر اس نے فوراً رخ موڑ لیا۔ اور وہ نادان نہیں تھے۔ ایک ذرا سی بات نے ہی بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ ایک نظر اس کے سراپے پر ڈالی، پھر کمرے سے لے کر بیرونی دروازے تک

دیکھتے ہوئے کئی سوال ایک ساتھ ذہن پر دستک دینے لگے تھے۔ اب تک شاید انہوں نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ ''الخضر'' سے نکل کر ایک چھوٹے سے کوارٹر میں کھڑی تھی۔ دل چاہا پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھوں کو تھام لیں اور پوچھیں۔ وہاں سے یہاں تک کیونکر آئی ہو۔ لیکن ایسا کوئی اختیار نہیں تھا اور نہ ہی وہ ایسا کوئی حق دینے پر آمادہ نظر آ رہی تھی۔

''آئی ایم سوری مسز رابعہ......!'' انہیں کہنا پڑا۔ ''بے جی گھر پر نہیں تھیں ورنہ میں اس وقت بھی ان سے اجازت لے کر ہی آتا۔''

وہ خاموشی سے ان کے قدموں کو دور جاتے ہوئے محسوس کرتی رہی، اور جب دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ تب طویل سانس لیتے ہوئے وہ بیڈ پر گر سی گئی۔ پھر سارا وقت وہ مختلف اندیشوں میں گھر کر اپنے آپ کو ہلکان کرتی رہی۔ اسے اپنی یہ پناہ گاہ بہت عزیز تھی، اور زیادہ خوف اس کے چھن جانے کا تھا۔ بار بار خیال آتا کہیں ڈاکٹر آصف کی یہاں آمد اس کے لیے الزام نہ بن جائے۔ اور پھر وقت کا ظالم پنجہ۔

''نہیں...... میرے خدا......!'' اس سے آگے وہ سوچتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔

دوپہر ڈھلی تو اس نے سوچا۔ وہ ڈاکٹر آصف کے آنے سے پہلے ہی کسی بہانے بے جی کے پاس جا بیٹھے، تاکہ ڈاکٹر آصف کو یہاں آنے کی ضرورت نہ پڑے۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ اٹھی اور جلدی جلدی علی کے کپڑے بدلنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہوئی تو وہیں کھڑے کھڑے ہاتھوں سے اپنے بال ٹھیک کیے، اور پھر علی کو گود میں لے کر کمرے سے نکل ہی رہی تھی کہ دروازے سے بے جی داخل ہوتی نظر آئیں۔ وہ ٹھٹھک کر وہیں رک گئی۔

''کیسا ہے علی......؟'' انہوں نے قریب آ کر پوچھا۔

''اب ٹھیک ہے۔ میں اسے آپ کے پاس ہی لا رہی تھی۔''

''اچھا......!'' انہوں نے کچھ سوچا پھر کہنے لگیں۔ ''آصف اسے دیکھنے آئے ہیں۔ میرا خیال ہے انہیں اندر بلا لو۔'' بے جی اس کی گود سے علی کو لے کر کمرے میں چلی گئیں۔ تو وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں......؟'' اس نے دروازہ کھولا تو وہ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگے۔

اس نے خاموشی سے ان کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

''میرے ساتھ فراز بھی ہے۔'' انہوں نے کہا، تو اس کی نظر فراز پر پڑی جو ان کے پیچھے کھڑا اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں کل بھی وہ اسے دیکھ کر نہ صرف بے اختیار ہوئی تھی بلکہ ایک انجانا احساس بھی جاگا تھا اور اب بھی ڈاکٹر آصف کو نظر انداز کر کے اسی کی طرف لپکنے کو دل چاہ

رہا تھا۔

"آؤ فراز......! وہ واقعی ڈاکٹر آصف کو نظر انداز کر گئی۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو وہ ان کے پیچھے چلتی ہوئی اندر آئی۔

"اب تو یہ کھیل رہا ہے۔" بے جی انہیں دیکھتے ہی علی کے بارے میں کہنے لگیں۔

"بخار تو نہیں ہے۔" آصف نے بڑھ کر پہلے علی کا ہاتھ تھاما پھر جرسی کے اندر ہاتھ ڈال کر سینہ اور پیٹ چیک کیا۔

"بخار نہیں ہے اور میرا خیال ہے۔ یہ پٹی بھی کھول دیتا ہوں، بس ہلکی ہلکی ٹیوب لگا دیجیے گا۔" وہ وہیں بیٹھ کر علی کے ماتھے پر بندھی پٹی کھولنے لگے تو وہ بے جی سے پوچھنے لگی۔

"بے جی......! چائے لاؤں۔"

"ہاں......! اس وقت ہم علی بابا کے مہمان ہیں اور چائے ضرور پئیں گے۔" بے جی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فراز بول پڑا۔ تو وہ بے جی کی طرف دیکھنے لگی۔ اور پھر ان کا اشارا ملنے پر ہی وہ چائے بنانے کے لیے کمرے سے نکلی تھی۔ کچن میں آ کر اس نے چولہا جلایا۔ کیتلی میں پانی ڈال کر چولہے پر رکھا، اور ابھی ٹرے میں کپ رکھ ہی رہی تھی کہ بے جی اس کے پیچھے آ گئیں۔

"سنو......! صرف چائے ہی مت لے جانا۔"

"جی......!" وہ کپ چھوڑ کر ریک پر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ علی کے بسکٹ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے وہی اٹھا کر بے جی کے سامنے کر دیے۔

"میرے پاس تو یہ ہیں۔" خلاف توقع بے جی ہلکے سے مسکرائیں۔

"میں ابھی کچھ سامان بھیجتی ہوں۔"

"بے جی آپ......!"

"تم لڑکی نہیں ہو، بچے کی ماں ہو۔ تمہیں پر اعتماد نظر آنا چاہیے۔" بے جی سمجھ گئی تھیں کہ وہ انہیں روکنا چاہتی ہے۔ اس لیے اسے ٹوک کر چلی گئیں۔

"پتا نہیں، بے جی مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔" اس نے سوچا اور چولہا دھیما کر کے ٹرے میں کپ کے ساتھ پلیٹیں بھی رکھنے لگی۔ ملازمہ نے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ اس کے آتے ہیں اس نے تمام لوازمات ٹرے میں سجا دیے، اور اسی کے ہاتھ اندر بھیج کر خود چائے دم کرنے لگی۔

جس وقت وہ چائے لے کر اندر آئی۔ فراز نیچے کارپٹ پر بیٹھا علی کے ساتھ کھیل رہا تھا اور ڈاکٹر آصف کسی میگزین کی ورق گردانی کرتے نظر آئے۔

"علی......!" ان دونوں کو متوجہ کرنے کی خاطر اس نے علی کو پکارا۔

"ارے......!" فراز اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ "آپ نے تو اچھا خاصا تکلف کر ڈالا۔"

"اتنا زیادہ تو نہیں۔" اس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ اور انہیں اپنی مدد آپ کا کہہ کر چائے بنانے لگی۔ علی گھٹنوں کے بل چلتا ہوا میز کا سہارا لے کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔

"آپ یہاں کیوں رہتی ہیں......؟" وہ بات جو ڈاکٹر آصف نے نہیں پوچھی تھی۔ فراز پوچھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا۔ آصف پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ شاید اس کا جواب سننے کے لیے۔

"بس یونہی۔" اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی، لیکن فراز کریدنے سے باز نہ آیا۔

"شاید آپ کی ساس ظالم قسم کی خاتون ہیں۔"

"نہیں......وہ بہت مہربان ہیں۔"

"پھر اس کوٹھری میں کیوں ڈالا آپ کو......؟"

"میں خود آئی ہوں۔ قدرے توقف کے بعد وہ وضاحت کرنے لگی۔" اصل میں گھر میں آنے جانے والے لوگ مجھے موضوع بناتے تھے، جو مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس لیے میں یہاں آ گئی۔

"آپ کا گھر نہیں ہے......؟"

"کون سا گھر......؟" وہ واقعی نہیں سمجھی اور سوالیہ نظروں سے فراز کی طرف دیکھنے لگی۔

"وہی جسے میکہ کہا جاتا ہے۔"

"ہے بھی اور نہیں بھی، خیر چھوڑیں۔ آپ چائے پئیں۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" اس نے دونوں کی توجہ چائے کی طرف دلائی اور خود علی کو گود میں لے کر بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔

"مسز رابعہ......!" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر آصف اسے مخاطب کر کے کہنے لگے۔

"فراز ایک لڑکی سے ملنے کی خواہش لیے میرے ساتھ یہاں تک آیا ہے۔ آپ پلیز اس کی مدد کریں۔" ان کا اشارا صبیحہ کی طرف تھا۔

"آصف بھائی......! مذاق کر رہے ہیں۔" فراز جھینپ کر بولا تو وہ اسے دیکھتے ہوئے کچھ کھو سی گئی۔

"آپ کیا سوچنے لگیں......؟" آصف سمجھے، وہ ان کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئی ہے۔

"کچھ نہیں۔" وہ علی کو وہیں بٹھا کر اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ کچن میں آ کر اس نے یونہی

پورا نل کھول دیا۔ بہتے پانی پر نظریں جمائے وہ کچھ الجھتی چلی جا رہی تھی۔

"میں گلا دبا دوں گا اس کا۔" ابا کی دھمکی آمیز اونچی آواز "خدا کے لیے چھوڑ دو میرے فراز کو۔" امی کی التجا۔

"فراز......! فراز......!" خود اس کا اس کے برابر ہونے کے باوجود اسے اپنی آغوش میں چھپانا۔

"کیا صرف اس کے نام میں کشش ہے۔" اس نے سوچا۔

"نہیں......" اندر کہیں سے آواز آئی۔ "مجھے اس میں اپنا آپ نظر آتا ہے۔ اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں۔"

بہتے پانی میں ایک شبیہ ابھرنے لگی۔ جسے چھونے کی خاطر اس نے پانی کے آگے ہاتھوں کا کٹورا بنا دیا۔ ایک پل میں ہاتھوں کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلکنے لگا تھا۔ اور ایک نہیں کتنے ہی چہرے بنتے اور مٹتے چلے جا رہے تھے۔

"رابعہ......!" کچن کے دروازے پر دستک دے کر ڈاکٹر آصف نے اسے متوجہ کرنا چاہا لیکن وہ اسی طرح کھڑی رہی، تب اندر داخل ہو کر انہوں نے نل کے نیچے اپنی ہتھیلی رکھ کر پانی کو روک دیا۔

"فراز......!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور ان پر نظر پڑی تو سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

"آئی ایم سوری......!"

ڈاکٹر آصف حیرت سے اس کی طرف دیکھے گئے۔ ان کے لیے حیرت کی بات تو تھی ہی کہ فراز بھی یہاں آنے کے لیے بہت بے چین تھا۔

"آپ اندر چلیں۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔" وہ ان کی ہتھیلی کے اوپر نل بند کرتے ہوئے بولی۔

"اب ہمیں اجازت دیجیے۔"

"وہ آپ کے بیٹے کے ساتھ مصروف ہے۔"

"اچھا......!" وہ سسک اٹھی۔ "پتا نہیں کیسے علی اس کے ساتھ اتنا مانوس ہو گیا ہے ورنہ تو وہ کسی کے پاس جاتا ہی نہیں۔" وہ ان کے ساتھ کچن سے نکلی۔ فراز علی کو اٹھائے انہی کے پاس آ رہا تھا۔

"چلیں آصف بھائی......!" وہ علی کو اس کی گود میں دیتے ہوئے بولا۔

"لیکن تمہارا مقصد تو پورا ہوا نہیں۔ میرا مطلب ہے جسے دیکھنے آئے تھے۔"

"میں رابعہ اور علی کو دیکھنے آیا تھا۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔ اور آصف جو اسے چھیڑنے کی خاطر یہ بات کہہ گئے تھے۔ اس کا جواب سن کر چپ سے ہو گئے تھے۔

○○○

بے جی نائلہ کی ازدواجی زندگی کی طرف سے مکمل طور پر مطمئن تھیں۔ جیسی تربیت انہوں نے خود اپنی اولاد کی، کی تھی۔ سسرال میں بھی اسے ویسا ہی ماحول ملا تھا۔ عاطف اور آصف دو ہی بھائی تھے، والدہ ان کی بچپن ہی میں اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ والد نے دونوں کی پرورش بہت اچھے ماحول میں کی تھی۔ تعلیم کے ساتھ اگر تربیت بھی اچھی ہو تو شخصیت میں خود بخود نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ دونوں بھائی زندہ مثال تھے۔

جس وقت آصف جہانگیر میڈیکل کے آخری سال میں تھے تب ان کے والد بھی اپنے مالک حقیقی کی طرف سفر کر گئے۔ گو کہ صدمہ گہرا تھا لیکن انہوں نے بہت حوصلے سے کام لے کر نہ صرف خود کو سنبھالا بلکہ عاطف کو بھی سہارا دیا۔ عاطف ان سے چار سال چھوٹا تھا اور اس وقت انٹر میں پڑھ رہا تھا۔ پھر جب آصف نے اپنی پریکٹس شروع کی تو خاندان کے زیادہ تر لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ وہ شادی کر لیں تاکہ گھر میں عورت کا وجود آ جائے جو ان کے ساتھ گھر کی ذمہ داریاں شیئر کر سکے۔ لیکن آصف کے سوچنے کا انداز مختلف تھا۔ ان کا کہنا تھا ضروری نہیں ہے کہ آنے والی ان کی ذمہ داریاں شیئر کرے وہ انہیں عاطف سے غافل بھی کر سکتی ہے..... اور وہ کسی طرح اپنے چھوٹے بھائی کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے اپنی ذات کو نظر انداز کر کے انہوں نے صرف عاطف کے لیے سوچا۔ ایک طرح سے والد کے بعد جو ذمہ داری ان کے کاندھوں پر آ پڑی تھی، اسے احسن طریقے سے نبھانے میں کامیاب ہو گئے۔ عاطف کی تعلیم اس کے بعد اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اور پھر نائلہ کے ساتھ شادی کہیں کوئی کمی نہیں تھی اور نہ ہی انہوں نے کسی پہلو سے اسے ادھورا رہنے دیا تھا۔ اور یہی بات بے جی کو پسند آئی تھی۔ ان کا خیال تھا والدین کے بغیر اکثر بچے بگڑ جاتے ہیں اور اگر بگڑتے نہیں تو تشنہ ضرور نظر آتے ہیں پھر اپنی تسکین کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کرتے ہیں جسے دوسرے لوگ پسند نہیں کرتے۔ لیکن یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ یقیناً ان کی رگوں میں شریف اور غیرت مند والدین کا لہو دوڑتا تھا اور پھر ان کے خاندان کے بقیہ لوگوں سے بھی بے جی کی کسی نہ کسی تقریب میں ملاقات ہو جاتی تھی۔

سب ہی بہت سلجھے ہوئے اور روشن خیال نظر آتے تھے۔ اور اب جو اسی خاندان سے صبیحہ کے لیے فراز کا پروپوزل آیا تو بے جی کو خوشی ہوئی۔ نائلہ کی پرسکون و پرمسرت ازدواجی زندگی کے

پیش نظر انہیں فیصلہ کرنے میں دشواری نہیں تھی۔ خضر حیات اور احتشام بھائی بھی اس رشتے کے حق میں تھے اور حق میں تو بے جی بھی تھیں لیکن آخری فیصلہ کرنے سے پہلے وہ نائلہ سے تفصیلی بات کرنا چاہتی تھیں شاید اندر کہیں یہ خیال تھا کہ ضروری نہیں کہ فراز، عاطف اور آصف جیسا ہی ہو۔ وہ نائلہ سے بات کر کے اپنا پورا اطمینان کر لینے کے بعد ہی حتمی فیصلہ کر سکتی تھی اور نائلہ تھی کہ ابھی کی وجہ سے ان سے خفا ہو کر آنا ہی چھوڑ رکھا تھا۔

کئی بار خیال آیا، وہ خود نائلہ کے پاس چلی جائیں۔ لیکن یہاں اپنا وقار مجروح ہوتا نظر آیا۔ شروع ہی سے اولاد کی نظروں میں انہوں نے اپنا جو مقام بنایا تھا، اسے قائم رکھنا چاہتی تھیں۔ اس لیے نائلہ کے پاس خود جانے کے خیال کو ہر بار انہوں نے جھٹک دیا۔ ادھر جب فراز کے والدین نے جلدی جلدی کا شور مچایا تو انہوں نے رابعہ کا سہارا لیا۔ اس شام وہ جان بوجھ کر آصف اور فراز کو اس کے پاس چھوڑ گئی تھیں اور اب اس سے پوچھ رہی تھیں۔

''تم نے فراز کو کیسا پایا......؟'' وہ حیران ہوئی۔ واقعی نہیں سمجھی تھی کہ وہ فراز کے بارے میں اس طرح کیوں پوچھ رہی ہیں۔

''کیا خیال ہے، وہ صبیحہ کے لیے مناسب رہے گا؟'' اسے شش و پنج میں دیکھ کر انہوں نے یوں بات کی۔

''آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں بے جی......!'' وہ یہی کہہ سکتی تھی۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن میں ہر طرح سے اپنا اطمینان چاہتی ہوں۔''

''میں آپ کو کس طرح اطمینان دلا سکتی ہوں جبکہ میں نے تو اسے ایک دو بار ہی دیکھا ہے۔'' بے جی کچھ دیر تک پرسوچ انداز میں اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں۔

''تم نائلہ سے بات کرو۔''

''میں......!''

''ہاں......! تم شام میں تیار رہنا۔ میں ڈرائیور سے کہوں گی۔ تمہیں نائلہ کے گھر چھوڑ آئے گا۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

''نائلہ تمہارے ساتھ زیادہ اٹیچ ہے اور میں سمجھتی ہوں، وہ تمہارے ساتھ زیادہ فرینک ہو کر بات کرے گی۔''

''جی......!'' وہ سر جھکا کر بس اتنا ہی کہہ سکی۔

''اور سنو......! علی کو میرے پاس چھوڑ جانا۔'' انہوں نے جاتے جاتے کہا اور کتنی دیر تک وہیں بیٹھی بے سروپا باتیں سوچتی رہی تھی۔

''شام میں بے جی کے کہنے کے مطابق وہ تیار ہو گئی اور اس کی تیاری کیا تھی، وہی سفید ساڑھی جو اس نے نائلہ کی شادی میں باندھی تھی۔ بالوں کی سیدھی شفاف مانگ جنہیں چوٹی میں گوندھ کر چھوڑ دیا۔ علی کو لے کر بے جی کے پاس آئی تو وہ اس کی منتظر تھیں۔ انہوں نے علی کو اس کی گود سے لے لیا اور کہنے لگیں۔

''میں نے ڈرائیور سے کہہ دیا ہے، تم چلی جاؤ۔ اور سنو۔ امید ہے واپسی میں تمہیں نائلہ چھوڑنے آئے گی۔ اسے دروازے سے واپس مت جانے دینا۔''

وہ سر ہلاتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی۔ ڈرائیور نے اسے دیکھتے ہی گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ حسام کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی پروگرام کے تحت گھر سے نکل رہی تھی۔ اپنے اکیلے پن کا شدت سے احساس ہوا اور تمام راستہ وہ اس احساس سے نکل نہ پائی۔ نائلہ کے گھر کے سامنے اُتری تو دل نامعلوم بوجھ تلے دب چکا تھا۔ کڑی دھوپ نہیں تھی لیکن بے سائبانی کا احساس تپش سے ہمکنار کرتے ہوئے تن من جلائے دے رہا تھا۔ یوں لگا تپتے صحراؤں میں ننگے پاؤں چلتی آ رہی ہو۔

ڈرائیور اسے چھوڑ کر جا چکا تھا اور شام کا وقت ہونے کے باوجود یہاں سے وہاں تک اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اسے ان اونچی اونچی عمارتوں کے درمیان اپنا تنہا وجود بہت عجیب لگا۔

ایک پل کو تو اسے خود اپنے آپ پر شبہ ہوا کہ وہ اسی دنیا کی باسی ہے یا کہیں سے راستہ بھٹک کر چلی آئی ہے۔

''کم از کم علی کو ہی ساتھ لے آتی۔'' اس نے سوچا اور سیاہ گیٹ کے کنارے لگے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ اندر کہیں مدھم سروں میں ٹیون بجنے لگی تھی۔ وہ بے خیالی میں بٹن سے اُنگلی ہٹانا بھول گئی تھی اور مسلسل بجتی بیل سے جھنجلا کر ہی زوردار آواز کے ساتھ گیٹ کھولا گیا تھا۔ وہ چونکی اور سر جھٹک کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ گیٹ سے ملازم کا چہرہ نمودار ہوا، اور اسے دیکھ کر اس نے پورا گیٹ کھول دیا۔ وہ اس سے کوئی بھی سوال کیے بغیر اندر داخل ہو گئی اور روش پار کر کے برآمدے تک آئی تو ملازم نے بتایا کہ نائلہ اور عاطف گھر پر نہیں ہیں۔

''ہیں......!'' وہ کتنی دیر تک ہونٹوں کو نیم وا کیے ہونق بنی کھڑی رہی۔

''ڈاکٹر صاحب موجود ہیں۔ انہیں اطلاع کر دوں۔'' ملازم پوچھ رہا تھا۔

''نائلہ کب تک آئے گی......؟'' وہ اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھنے لگی۔

''پتا نہیں جی......آپ ڈاکٹر صاحب سے معلوم کر لیں۔'' وہ فوری جواب دینے کے بجائے سوچ میں پڑ گئی۔ دل چاہا یہیں سے واپس پلٹ جائے لیکن ڈرائیور واپس جا چکا تھا۔ اس نے سوچا

کسی بھی طرح چلی جاؤں گی۔ یہاں رُکنا ٹھیک نہیں ہے۔

''میں چلتی ہوں۔ نائلہ آئے تو اس سے کہہ دینا۔'' اس نے کہا اور واپس مڑنا ہی چاہتی تھی کہ ڈاکٹر آصف باہر آ گئے۔ اسے دیکھ کر لمحہ بھر کو وہ ٹھٹکے تھے۔

''آپ......!''

''جی وہ بس......''

''یہاں کیوں رُک گئیں......؟ اندر آئیں ناں......'' وہ جانتے تھے۔ وہ ان تین لفظوں کے آگے کچھ نہیں کہے گی پھر بھی یوں بات کی جیسے اس کی بات کاٹ گئے ہوں۔

''میں نائلہ سے ملنے آئی تھی۔''

''میں جانتا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولے۔

''نائلہ اور عاطف ابھی کچھ دیر پہلے نکلے ہیں۔ وہ گھر پر نہیں ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ یہیں سے واپس چلی جائیں آیئے۔''

وہ سر جھکا کر ان کے پیچھے اندر داخل ہو گئی۔ اسے بٹھا کر وہ کمرے سے نکل گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے تو وہ اپنے آپ پر کافی حد تک قابو پا چکی تھی۔ انہوں نے سامنے بیٹھتے ہوئے بغور اس کی طرف دیکھا پھر کہنے لگے۔

''اگر آپ آنے سے پہلے فون کر دیتیں تو نائلہ اور عاطف اپنا پروگرام کینسل کر دیتے۔''

''ہاں......! مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن خیال نہیں رہا۔'' اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اعتراف بھی کیا۔

''آپ علی کو ساتھ نہیں لائیں۔''

''وہ بے جی کے پاس تھا۔'' کچھ دیر رک کر کہنے لگی۔ ''میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔''

''چائے آ رہی ہے۔''

''چائے پھر سہی۔'' وہ اٹھنے لگی تو انہوں نے روک دیا اور خود اٹھ کر چلے گئے۔ واپس آئے تو چائے کی ٹرے ہاتھوں میں تھی۔ وہ خاموشی سے انہیں چائے بناتے ہوئے دیکھنے لگی۔ پھر جانے کیا خیال آیا کہ انہی سے پوچھنے لگی۔

''فراز آپ کا کزن ہے۔'' وہ ایک دم ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھنے لگے، جبکہ وہ اپنی کہے گئی۔

''اچھا لڑکا ہے۔ مجھے بہت پسند ہے لیکن بے جی شاید پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب......؟''

''وہ صبیحہ کی ماں ہیں اور ظاہر ہے، اپنا پورا اطمینان کرنے کے بعد ہی اس رشتے کے لیے ہامی بھریں گی۔''

''ہاں......!'' ہاں کی صورت انہوں نے سینے میں دبی سانس خارج کی۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر چائے کا کپ اسے تھمایا۔

''شکریہ......!'' اس نے کہا اور کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

''فراز آپ سے بہت متاثر ہے۔'' وہ کہنے لگے۔ ''وہ بہت دیر تک نائلہ سے آپ کے بارے میں پوچھتا رہا۔''

''کیا......؟'' وہ ایک دم سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''وہ باتیں جن کی پردہ پوشی کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا کہ آپ اپنی مرضی سے الخفر سے نکل کر اس چھوٹے سے کوارٹر میں منتقل ہوئی ہیں۔''

''حقیقت بھی ہے۔'' وہ فوراً بولی۔

''حقیقت یہ نہیں ہے رابعہ بیگم......! حقیقت وہ ہے جو نائلہ نے کہی اور اس کی تصدیق آپ کا سراپا کر رہا ہے۔''

اس کی نظریں جھکانے پر کہنے لگے۔

''بہر حال...... دکھ کی بات ہے کہ بے جی نے آپ کو زندگی کی خوشیوں سے محروم کر رکھا ہے۔ آپ احتجاج کیوں نہیں کرتیں۔ زیادہ سے زیادہ بے جی یہی کریں گی کہ آپ کو اس کوارٹر سے بے دخل کر دیں گی پھر اس کے بعد دنیا اتنی چھوٹی نہیں ہے کہ آپ کو کہیں امان نہ مل سکے۔''

''میں اب چلوں گی۔'' ان کی باتوں کے جواب میں وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نائلہ ٹھیک کہتی ہے۔ آپ خود بزدل ہیں۔ حالات سے لڑنا ہی نہیں چاہتیں۔ ذرا سا حوصلہ پیدا کریں۔ حالات خود بخود آپ کے تابع ہو جائیں گے۔''

''ڈاکٹر آصف پلیز......! آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔''

''وقت کے زیاں کا احساس ہے آپ کو۔'' وہ اس کے مقابل آ کھڑے ہوئے۔

''بہت دیر ہو گئی ہے، مجھے چلنا چاہیے۔''

''پہلے ایک بات کی وضاحت کر دیں پھر جانے کی بات کریں۔'' وہ سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''بے جی نے آپ کو یہاں تک آنے کی اجازت کیسے دی......؟''

''کس سلسلے میں......؟'' وہ ٹپٹا گئی۔ فوری طور پر کوئی جواب بھی نہیں بن پڑا۔ سر جھکا کر

ساڑھی کے پلو کو انگلی میں لپیٹنے اور کھولنے لگی۔

"بیٹھ جائیں۔" انہوں نے ہاتھ بڑھایا۔ شاید اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بٹھانا چاہتے تھے لیکن وہ خود ہی جلدی سے بیٹھ گئی۔

"ہاں...... اب بتائیں، کیا بات ہے......؟"

"اصل میں بے جی فراز کے سلسلے میں نائلہ سے مشورہ کرنا چاہ رہی تھیں اور وہ چونکہ بے جی سے خفا ہے۔ اس لیے انہوں نے مجھے بھیجا ہے کہ میں اس سے بات کر لوں۔"

"فراز کے بارے میں بے جی کو یقین دلا دیجیے کہ وہ اسے کسی طرح بھی عاطف سے کم نہیں پائیں گی۔ گو کہ وہ چچا جان کی اپنی اولاد نہیں ہے لیکن اس کی تعلیم اور تربیت میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اگر چچا جان کی اپنی اولاد بھی ہوتی تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ فراز کی طرح ہوتی اس سے بڑھ کر وہ اس کی تربیت نہیں کر سکتے تھے۔"

"کیا فراز......؟"

"ہاں......! فراز چچا جان کا بیٹا نہیں ہے۔" وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑے۔ "کیونکہ چچا جان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے انہوں نے بچپن ہی میں اسے گود لے لیا تھا۔"

"کس کا بیٹا ہے وہ......؟"

"میں نہیں جانتا اور میرا خیال ہے ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا۔"

"کیا فراز بھی نہیں جانتا......؟"

"کہہ نہیں سکتا، کیونکہ ہم نے کبھی اس سے اس سلسلے میں بات نہیں کی۔"

وہ خاموش ہو کر جانے کیا سوچنے لگی۔ پھر ان کی طرف دیکھا وہ اسی طرح کھڑے تھے۔

"اب تو میں جا سکتی ہوں۔" اس کے سادگی سے پوچھنے پر وہ ہلکے سے مسکرائے۔

"کیسے جائیں گی......؟"

"کوئی رکشا یا ٹیکسی منگوا دیں۔"

"چلیے......! میں چھوڑ آتا ہوں۔" اس کا جواب سنے بغیر انہوں نے ملازم کو آواز دے کر اپنے جانے کا بتایا اور اسے آنے کا کہہ کر خود اس سے پہلے ہی باہر نکل گئے تو وہ طویل سانس لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان کے پیچھے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"بے جی تک میرا ایک پیغام پہنچا دیجیے گا۔" وہ گھر کے سامنے اتری تو وہ اسے پکار کر کہنے لگے۔

"آج میں نے جس جگہ آپ کو چھوڑا ہے۔ کبھی وقت آنے پر یہیں سے آپ کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آؤں گا۔"

"ڈاکٹر آصف......!" ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ آنکھوں میں حیرت، خوف اور جانے کیا تھا۔ انہوں نے اس کی پوری کھلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی آگے بڑھا لے گئے۔ وہ کتنی دیر تک وہیں کھڑی ان کی گاڑی کو دور جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوئی، تب وہ بھی اندر آ گئی۔ اسے اکیلے دیکھ کر بے جی فوراً پوچھنے لگیں۔

"نائلہ نہیں آئی......؟"

"نائلہ گھر پر نہیں تھی۔ بے جی! میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

پھر اس نے کھڑے کھڑے اپنے اور ڈاکٹر آصف کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو کہہ سنائی۔

"فراز اس گھر کا فرد نہیں ہے......؟" اس کی ساری بات سننے کے بعد بے جی نے بس اتنا کہا۔ اس کے بعد وہ انتظار کرتی رہی کہ وہ کچھ اور بھی کہیں گی لیکن انہوں نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔

"علی کہاں ہے......؟" وہ کھڑے کھڑے تھک گئی تو پوچھنے لگی۔

"وہ صبیحہ کے پاس ہے۔"

"میں جاؤں بے جی......!"

"ہاں......!" انہوں نے اجازت دی تو وہ ان کے کمرے سے نکل آئی۔

صبیحہ برآمدے ہی میں علی کو گود میں لیے ٹہلتی نظر آئی۔ اس نے وہیں سے علی کو لیا اور صبیحہ سے معذرت کر کے وہاں سے چلی آئی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ شروع کے چند دنوں میں ڈاکٹر آصف کی باتوں سے وہ ڈسٹرب رہی پھر وقت گزرنے کے ساتھ ہر خیال پس منظر میں چلا گیا۔ ویسے بھی اس دن کے بعد سے ان کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اور وہ چاہتی بھی نہیں تھی۔ ادھر علی کچھ دنوں سے چھوٹے چھوٹے لفظ بولنے لگا تھا جس سے اس کی ساری توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ جب خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں سے ماں نکلتا تو وہ جیسے اپنے سارے دکھ بھول جاتی۔ کتنا معتبر کر دیا تھا اس ایک لفظ نے اسے۔ وہ اپنے آپ کو بہت مضبوط تصور کرنے لگی۔ وہ اب صرف اس کی نہیں سنتا تھا۔ اپنی بھی کہنے کی کوشش کرتا تھا۔ جس طرف جاتی، اس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ کچن میں کام کرتی تو

اس کے ساتھ کھڑا ہو کر ایک ایک چیز کے بارے میں پوچھتا۔ ہر چیز کے بارے میں اس کا ایک ہی
سوال ہوتا۔

"یہ کیا ہے......؟"

اس کی آواز نے خاموشی کو توڑ دیا تھا اور اس کے ننھے سے وجود نے اکیلے پن کے احساس کو
بھی مٹا دیا تھا۔ وہ اپنی اس چھوٹی سی دنیا میں بہت حد تک مطمئن ہو گئی تھی۔

"زندگی کی ناؤ اگر اسی طرح پرسکون دھارے پر بہتی رہے تو مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں
رہے گا۔" وہ سوچتی تھی۔

○○○

اسے ابا کے پاس گئے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے۔ گو کہ وہاں جا کر اور ان کی حالت دیکھ کر
وہ کڑھتی ہی تھی اور دل پر بوجھ لیے ہی واپس آتی تھی۔ لیکن انہیں دیکھے بغیر چین بھی نہیں آتا تھا۔
کچھ بھی سہی بہر حال اس کے باپ تھے اور بیٹیاں تو ویسے بھی ماں باپ کے لیے نرم جذبے ہی لے
کر پیدا ہوتی ہیں۔

اس دن انہیں دیکھنے کو زیادہ دل مچلا تو اس نے بے جی سے اجازت لی اور آ کر ایک بیگ
میں علی کے کپڑے رکھنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے علی کو تیار کیا اور جانے کے لیے تیار ہو
گئی۔

باہر آئی تو ڈرائیور گاڑی لیے کھڑا تھا۔ وہ چپ چاپ اس میں بیٹھ گئی۔ مخصوص راستوں پر
گاڑی دوڑنے لگی۔ اس نے علی کو سیٹ پر کھڑا کر دیا تھا۔ اور وہ باہر کی ہر چیز کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" وہ کسی وقت جواب دیتی ورنہ نظر انداز کر
دیتی۔ ابھی زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اور وہ جو اپنے خیال میں
بیٹھی تھی، ایک دم چونک گئی۔

"کیا ہوا......؟" وہ ڈرائیور سے پوچھنے لگی۔

"پتا نہیں جی...... میں دیکھتا ہوں۔"

"ڈرائیور اُتر گیا اور بونٹ اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ وہ بہت جلد بیزار ہو گئی علی بھی بسورنے لگا تھا۔
وہ اسے بہلانے کی خاطر شیشے سے باہر مختلف چیزیں دکھاتے ہوئے ان کے بارے میں بتانے
لگی۔

"رابعہ......!" دوسری طرف کے شیشے سے کسی نے پکارا تو وہ فوراً گردن موڑ کر دیکھنے لگی اور

فراز کو دیکھ کر وہ کھل کر مسکرائی۔

"کوئی پرابلم ہے......؟" وہ پوچھنے لگا۔

"ہاں شاید......!" اس نے کہا تو فراز جا کر ڈرائیور سے بات کرنے لگا پھر اس کے پاس آ
کر بولا۔

"کوئی بڑی خرابی لگتی ہے۔ آیئے۔ آپ میری گاڑی میں آ جائیں۔"

"ہو سکتا ہے، ابھی ٹھیک ہو جائے۔"

"ویسے آپ کو جانا کہاں ہے......؟"

"میں اپنے والد کے گھر جا رہی ہوں۔"

"آیئے...... میں چھوڑ دوں گا، آیئے پلیز......!"

اس نے اصرار کیا تو وہ علی کو لے کر اتر آئی پھر ڈرائیور سے کہہ کر اس کی گاڑی میں جا بیٹھی۔
وہ اس کے بتائے ہوئے راستے پر خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

"بہت دنوں سے تم آئے نہیں۔" وہ یونہی بات کرنے کی غرض سے بولی۔

"آپ کی وہ بے جی جنہیں آپ نے مہربان خاتون کہا تھا۔ ان کی وجہ سے۔"

"انہوں نے تمہیں آنے کو منع کیا ہے......؟"

"نہیں......"

"پھر......؟"

"وہ بہت عجیب و غریب خاتون ہیں، سمجھ میں نہ آنے والی۔" قدرے توقف کے بعد بولا۔

"ظالم سماج بھی ہیں۔ پتا نہیں آپ نے کس وجہ سے انہیں مہربان کہا تھا جبکہ خود آپ کو بھی
انہوں نے اپنی غلط روایتوں کی بھینٹ چڑھا رکھا ہے۔"

"نہیں تو شاید تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"غلط فہمی۔" وہ تلخی سے ہنسا۔ "چلیے تو ان سے کہیے۔ میرا حسب نسب جانے بغیر صبیحہ کا ہاتھ
میرے ہاتھ میں تھما دیں۔"

"بس یہیں روک دو۔" اس نے گھر آنے پر شکر ادا کیا کہ وہ مزید اس کی باتیں سننے سے بچ
گئی تھی۔

"یہاں......" گاڑی روک کر وہ حیرت سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

"ہاں......! میں کسی بہت بڑے باپ کی بیٹی نہیں ہوں۔" اپنی طرف کا دروازہ کھول کر وہ
اتر گئی اور وہ بھی کچھ حیران حیران سا نیچے اتر آیا۔ گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا تو سامنے ادھ کھلے

دروازے پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ وہ چکر کاٹ کر اس کے پاس آئی تو وہ گم صم سا کھڑا تھا۔

"آؤ فراز......! اندر چلو۔" پتا نہیں اس سے بات کرتے ہوئے وہ اتنی شفیق کیوں ہو جایا کرتی تھی۔

"نہیں......" وہ جیسے خوفزدہ ہوا۔ "میں اندر نہیں جاؤں گا۔ وہ میرا گلا دبا دیں گے۔" اس کے ہاتھ اپنی گردن پر چلے گئے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں......؟" وہ اس کے بازو کو تھام کر پوچھنے لگی۔

"ہیں......!" وہ چونکا اور زور زور سے سر کو جھٹکے دینے لگا۔

"شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

"اس نے علی کا ہاتھ تھاما اور اس سے چلنے پر اصرار کیا تو وہ کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چل پڑا۔

دروازے سے اندر داخل ہوئی تو سامنے سے نادر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کسی اجنبی کو دیکھ کر وہیں رک گیا۔ پہلے بغور دونوں کا جائزہ لیا پھر دھاڑ کر پوچھنے لگا۔

"کون ہے یہ......؟" ابھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ کہنے لگا۔

"رابعہ......! ایک بار تو میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی لیکن اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ کہہ دے اپنے یار سے یہاں سے چلا جائے ورنہ......"

"فراز......!" اس نے سہمی ہوئی آواز میں پکارا اور دوسرے پل فراز نے علی سمیت اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا اور اچانک وقت کا پہیہ الٹا چلنے لگا۔

ابا کا دروازے ہی سے گالیاں دیتے آنا۔ امی سے پیسوں کا مطالبہ، پھر انہیں مارنا اور ان دونوں بہن بھائی کا ایک دوسرے کے بازوؤں میں پناہ گزین ہو کر کسی کونے میں دبک جانا۔ گزرے وقت کا ہر پل اس کی آنکھوں اور اس کے ذہن میں واضح ہوتا چلا گیا اور رابعہ کے گرد اپنے بازوؤں کا گھیرا تنگ کرتا گیا۔

"کیا لگتا ہے یہ تیرا جو تو اس کے ساتھ چپکی کھڑی ہے۔" نادر کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"بھائی ہوں میں اس کا۔" وہ رابعہ سمیت اس کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔

"بھائی......!" نادر نے قہقہہ لگایا۔

"ہاں بھائی......! اس کا ماں جایا۔" پھر اس کا چہرا ہاتھوں میں لے کر کہنے لگا۔ "رابعہ......! تم نے پہچانا مجھے...... میں فراز ہوں۔ تمہارا اپنا بھائی فراز۔ دیکھو وہاں کھڑے ہو کر ابا نے میرا گلا

دبانے کی کوشش کی تھی اور میں بمشکل اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگا تھا۔"

"فراز......! میرے بھائی......! اس کی آنکھوں میں سیلاب اُترا تھا اور ابھی پلکوں کے بند ٹوٹے نہیں تھے کہ وہ اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔

"رابعہ......! رابعہ......!" اس نے پریشان ہو کر اسے کتنی آوازیں دے ڈالیں۔ لیکن اتنی بڑی خوشی اس کا ناتواں دل سنبھال نہیں پایا تھا۔ اس نے اپنی نازک سی بہن کو بازوؤں پہ اٹھایا اور علی کو ساتھ آنے کا کہہ کر اندر چلا آیا۔

کمرے میں اماں زرینہ بیگم موجود تھیں۔ رابعہ کو ایک اجنبی کے بازوؤں میں دیکھ کر حقیقتاً پریشان ہو گئیں۔

"کیا ہوا ہے اسے......؟" دہل کر پوچھنے لگیں۔

"شاید بیہوش ہو گئی ہے۔"

اس نے رابعہ کو آرام سے چار پائی پر لٹایا اور خود ڈاکٹر کو لینے بھاگا۔ جب تک وہ ڈاکٹر کو لاتا۔ اماں اپنے طور پر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہیں۔ پھر ڈاکٹر نے آ کر انجکشن لگایا۔ وہ بڑی بے چینی سے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

اس دوران وہ بار بار زرینہ بیگم کو دیکھتا اور پھر اس کی نظریں چاروں طرف بھٹکنے لگتیں جیسے کسی مانوس چہرے کو تلاش کر رہا ہو۔ رابعہ پر نظر ٹھہری تو ذہن پر برسوں پہلے کا نقش وہ چہرا جسے وقت کی گرد نے دھندلا دیا تھا۔ واضح ہونے لگا۔

"امی......!" اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور وہ اس کے اوپر جھک گیا۔ بڑی محبت سے اس کا چہرا ہاتھوں میں لے کر پکارنے لگا۔

"رابعہ......! آنکھیں کھولو رابعہ......!" برسوں بعد کسی نے یوں شفقت سے پکارا تھا۔ وہ مر بھی جاتی تو اس پکار پر کچھ دن مستعار لے کر چلی آتی۔ اب تو صرف بیہوش تھی۔ فوراً آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی۔

"تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔" وہ اطمینان کا سانس لے کر مسکرانا چاہتا تھا لیکن آنکھیں چھلک پڑیں۔

"فراز......!" وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور اس کے سینے سے جا لگی۔

اماں حیران کھڑی دونوں کو بچوں کی طرح روتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ ماجرا کیا ہے۔ شبو کو بلا کر پانی منگوایا اور بڑی مشکل سے دونوں کو الگ کر کے پانی پلایا۔ پھر فراز کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

''اماں...... ! یہ میرا بھائی ہے فراز ...... !'' اس نے کہا تو وہ باری باری دونوں کو دیکھنے لگیں۔

''امی کہاں ہیں ......؟'' وہ اس سے پوچھنے لگا۔

''تم چلے گئے تو وہ بھی چلی گئیں۔ اب تو یہ اماں ہیں۔'' اس نے زرینہ بیگم کی طرف دیکھا پھر مختصراً تمام حالات کہہ سنائے۔ گو کہ اس نے اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ذکر نہیں کیا تھا پھر بھی وہ بہت کچھ جان گیا تھا۔ اور پھر بھی گھر میں داخل ہوتے ہوئے نادر نے جس لہجے میں بات کی تھی، اسے سوچ کر تو اب اس کا خون کھولنے لگا تھا۔

''آپا...... ! یہ اب مجھ سے نہیں بہل رہا۔'' شبو جو بہت دیر سے علی کو گود میں لیے ادھر ادھر ٹہلاتے ہوئے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے پاس آ کر بولی۔

''لاؤ ...... مجھے دے دو۔'' اس نے علی کو لیا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتی ہوئی کہنے لگی۔ ''فراز! یہ بھی تمہاری بہن ہے اور نمو اس سے چھوٹی ہے۔ کمال اور ناصر غالباً کام پر گئے ہیں۔ شام میں آئیں گے تو ان سے مل لینا۔''

''اور جو دروازے پر ملا تھا، وہ کون ہے۔''

''وہ نادر ہے۔'' پھر فوراً بات بدل گئی۔ ''ارے تم ابا سے تو ملے نہیں، آؤ ابا کے پاس چلتے ہیں۔''

وہ چارپائی سے اتر آئی تو وہ بھی اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئے تو ابا اپنے مخصوص کونے میں بیٹھے نظر آئے۔ وہ قدم روک کر ان کی طرف دیکھے گیا۔

''یہی ہے وہ شخص جس کے ظالمانہ سلوک نے مجھے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا۔

''میں اپنی ماں اور بہن کو بے آسرا چھوڑنے کا گناہ گار ہوا۔ میری ماں میری راہ تکتے تکتے مٹی میں جا ملی اور بہن حوادث زمانہ کا مقابلہ کرنے کو تنہا رہ گئی۔ میں اسے معاف نہیں کروں گا۔'' سوچتے ہوئے گئے دنوں کا عکس اس کی آنکھوں میں جھلملا رہا تھا۔

''فراز......!'' وہ اس کا بازو ہلا کر بولی۔ ''آؤ ناں......''

''مجھے اس شخص سے ملنے کو مت کہو رابعہ...... ! میں اس سے۔''

''فراز......!'' اس نے ٹوکا۔ ''گئے دنوں کی باتیں مت کرو۔ اور پھر اپنے کیے کی سزا وہ خود ایک مدت سے بھگت رہے ہیں۔ تم دیکھ نہیں رہے کہ اس گھر کے مالک ہونے کے باوجود ایک کونے میں پڑے ہیں۔ کوئی ان کا پرسان حال نہیں۔ اور سنو میرے بھائی! تم اپنا دل بڑا رکھو۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ امی ہمارے بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھتی تھیں۔ اور بڑا آدمی وہ نہیں ہوتا جو

اونچے محلوں میں رہتا ہو، اور جس کے پاس ڈھیر ساری دولت ہو۔ بڑا وہ ہوتا ہے، جس کا دل بڑا ہو۔ آؤ انہیں یقین دلا دو کہ وہ اکیلے نہیں رہے۔ تم ان کے بڑھاپے کو سہارا دینے آ گئے ہو۔ یقین کرو۔ تمہارے اس اقدام سے امی کی روح کو بہت سکون ملے گا۔''

وہ جب چھوٹی تھی، تب بھی اپنی باتوں سے اسے رام کیا کرتی تھی۔ اب بھی اس کے دل اور ذہن کو گرفت میں لے لیا کہ وہ بے اختیار آگے بڑھا اور ابا کے کمزور وجود کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا، پھر وہ انہیں یقین دلا رہا تھا کہ اب وہ اکیلے نہیں رہے، وہ ان کے بڑھاپے کو سہارا دینے آ گیا ہے۔ پہلی بار اس گھر میں ایک خوشگوار سی ہلچل جاگی تھی۔ سب ہی خوش تھے۔ زرینہ بیگم کے رویے میں تو اسی وقت لچک پیدا ہو گئی تھی جب رابعہ نے اس گھر کو چھوڑا تھا۔ اب وہ صرف اپنے مسائل کا رونا روتی تھیں بہرحال اس وقت وہ بھی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں اور شبو، نمو کے ساتھ مل کر دوپہر کے کھانے کا خاص اہتمام کر رہی تھیں۔ نادر البتہ خوش نہیں تھا اور کیونکہ کچھ کر نہیں سکتا تھا، اس لیے گھر سے ہی نکل گیا۔ اور فی الحال اس کے جانے کی کسی کو پرواہ بھی نہیں تھی۔ سب اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے اور وہ دونوں بہن بھائی تنہائی سے فائدہ اٹھا کر ایک دوسرے کو ان درمیانی ماہ و سال کا احوال سنانے لگے۔ فراز نے اپنے بارے میں بتایا۔

''میں جب یہاں سے نکلا تو بہت خوفزدہ تھا بس یہی خیال کہ ابا مجھے مار ڈالیں گے مجھے یہاں سے بہت دور لے گیا، میں راستوں سے واقف نہیں تھا بس بھاگتا چلا گیا۔ پھر رات ہو گئی ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ میں بھی تھک گیا تھا۔ ایک جگہ بیٹھا تو وہیں سو بھی گیا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو رحمٰن صاحب کے گھر تھا۔ رات کو جانے کس وقت وہ مجھے اٹھا کر اپنے گھر لے گئے تھے۔ پھر انہوں نے بہت کوشش کی کہ میں اپنے گھر والوں کے بارے میں بتاؤں، لیکن میں اتنا خوفزدہ تھا کہ کبھی بتا کے نہیں دیا۔ بس یہی خیال آتا اگر میں بتاؤں گا تو یہ مجھے واپس چھوڑ آئیں گے اور پھر ابا مجھے مار ڈالیں گے۔ یوں میں انہی کے گھر رہنے لگا۔ ان کی اپنی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے ہی اپنی اولاد سمجھ لیا۔ لیکن رابعہ میں کبھی تمہیں اور امی کو نہیں بھولا۔ جب بڑا ہوا اور ابا کا خوف بھی نہیں رہا۔ تب میں نے تمہارے اور امی کے پاس آنا چاہا لیکن وقت کی گرد نے راستوں کو دھندلا دیا تھا۔ پھر بھی اپنے طور پر بہت کوشش کی کسی طرح تم تک پہنچ جاؤں لیکن کامیابی نہیں ہوئی...... اور آج جب اس دروازے سے نکل کر بھاگا تھا۔ تم نے غور نہیں کیا۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے کہا تھا۔

''میں اندر نہیں جاؤں گا وہ میرا گلا دبا دیں گے۔'''' یعنی میرے لاشعور میں اب بھی یہ

خوف موجود تھا۔" وہ اس کے ہاتھ کو آہستہ تھپکنے لگی جیسے اسے اس خوف سے نکال رہی ہو۔ پھر کہنے لگی۔

"پتا ہے فراز......! میں نے تم سے ملنے کی بہت دعائیں مانگی تھیں۔ کبھی کبھی مایوس بھی ہوئی لیکن پھر امید کا دامن تھام لیا......اور اب مجھے لگ رہا ہے جیسے میں ایک دم بہت مضبوط ہو گئی ہوں، اور وقت کا ظالم پنجہ جو ہمیشہ میری تاک میں رہا۔ میری چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو دبوچنے میں اس نے کبھی دیر نہیں کی لیکن اب۔"

"میں اسے تمہاری طرف بڑھنے نہیں دوں گا۔"

"ہاں فراز......! ہم مل کر اسے مات دیں گے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ "اگر سوچو فراز تو اس گھر میں کبھی کوئی خوشی نہیں اتری۔ یہ نہیں کہ ہم نے نہیں دیکھی بلکہ کبھی خوشی آئی ہی نہیں۔ امی سے پہلے دادی بھی حالات کا شکار رہیں، پھر امی اور ان کے بعد غیر جانبداری سے سوچو تو اماں (زرینہ بیگم) بھی حالات کی چکی میں پستی رہی ہیں۔"

"اور یہ سب ابا کی وجہ سے ہوا۔" اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے وہ بول پڑا۔ "تم برا مت ماننا رابعہ! میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ گھر کا دارومدار گھر کے سربراہ پر ہوتا ہے۔ اور اگر سربراہ ہی ٹھیک نہ ہو تو گھر کا شیرازہ یوں بکھرتا ہے خوشیاں راستہ بھول جاتی ہیں اور دکھ ہر پل دستک دیے چلے آتے ہیں۔ ہم لاکھ امید کا دامن تھامیں، یا لاکھ آس کے دیے روشن رکھیں، انتظار فصل گل طویل سے طویل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ ظاہر ہے انسان وہی کاٹتا ہے جو بویا گیا ہو گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سربراہ تو دکھوں کے بیج بوئے اور ہم فصل گل کاٹنے کی بات کریں اور یہی بات رابعہ تم اپنی بے جی کو بھی سمجھا دینا۔"

"انہوں نے اگر اپنے غلط نظریات، ضد اور ہٹ دھرمی نہ چھوڑی تو ان کے گھر کا بھی اللہ حافظ ہے۔ آج نائلہ بھابی ان سے خفا ہیں، کل ایک ایک کر کے سب الگ ہو جائیں گے تب ان کی سمجھ میں آئے گا۔"

"اللہ نہ کرے فراز، جو اس گھر کو کسی کی نظر لگے۔" وہ خلوص دل سے بولی۔

"تمہیں کیا دیا ہے اس گھر نے جو دل میں ان کا درد رکھتی ہو......؟"

"بہت کچھ......" وہ بولی۔ "اتنا تو ساری زندگی نہیں ملا، جتنا ایک برس میں حسام نے دیا اور اسی کے ناتے مجھے وہ گھر اور اس کے مکین بہت عزیز ہیں۔"

وہ کچھ دیر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر پوچھنے لگا۔

"حسام کیسا تھا......؟"

"دیوتا تھا......میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اس کی تعریف کے لیے اور تم اس کی اچھائی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"میرا خیال ہے، میں اندازہ کر سکتا ہوں۔"

"کیسے......؟"

"نائلہ بھابی کو دیکھ کر۔"

"ہاں......! وہ بہت حد تک اپنے بھائی سے ملتی ہے۔ نہ صرف شکلاً بلکہ عادتاً بھی۔"

"اور صبیحہ......؟"

"صبیحہ بھی بہت اچھی ہے۔" پھر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ "تم کب سے جانتے ہو صبیحہ کو......؟" وہ ہنس پڑا۔

"بتاؤ ناں......"

"پہلے نائلہ بھابی کی شادی میں دیکھا تھا۔ پھر یونیورسٹی میں دیکھنے میں اچھی لگتی تھی پھر جب معلوم ہوا کہ نائلہ بھابی کی بہن ہے تو سوچا۔ یقیناً عادت کی بھی اچھی ہو گی۔ پہلے راہ و رسم بڑھائی پھر شادی کی بات کی۔ وہ بھی یہی چاہتی ہے لیکن بے جی۔"

"ہو سکتا ہے، اب بے جی انکار نہ کریں۔" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اماں آ گئیں۔ کھانا لگنے کی اطلاع دی تو وہ کہنے لگی۔

"معاف کیجیے اماں......! میں آج بالکل آپ کا ہاتھ نہ بٹا سکی۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا......! چلو اب جلدی سے آجاؤ۔" وہ فراز کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی پھر کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ ابا بھی پہلی بار دسترخوان پر سب کے ساتھ شریک تھے۔ زیادہ باتیں تو نہیں کیں بس فراز سے اتنا پوچھا۔

"اب تو تم یہیں رہو گے ناں......" اس نے انکار تو نہیں کیا سہولت سے یہ بات سمجھا دی کہ جن لوگوں نے ایک عمر اپنی اولاد سمجھ کر پرورش کی ہے۔ انہیں یوں چھوڑ دینا انسانیت نہیں ہے۔ رابعہ بھی اس کی بات سے متفق تھی۔ ویسے اس نے یقین دلایا کہ اب وہ اس گھر سے غافل نہیں رہے گا اور اسے غافل رہنا بھی نہیں چاہیے تھا، نہ صرف ابا بلکہ اس پورے گھر کو اس کی ضرورت تھی۔

کھانے کے بعد وہ علی کو سلانے کے لیے لیٹی تو اسے بھی نیند آ گئی۔ وہ اس وقت نہیں سوتی تھی اگر آنکھ لگ بھی جاتی تو کچھ دیر میں اٹھ بھی جاتی تھی لیکن آج ایک مدت بعد وہ گہری اور پرسکون نیند سوئی کہ شام میں اماں کے اٹھانے پر ہی اٹھی تھی۔ اپنے آپ پر حیران ہوتی

ہوئی کمرے سے نکلی تو سب بہن بھائیوں کو آنگن میں بیٹھے دیکھا۔ فراز سب کے ساتھ یوں بیٹھا تھا جیسے شروع سے ہی ان کے ساتھ رہا ہو۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا، اور منہ ہاتھ دھو کر ان کے پاس آ بیٹھی۔ شبو چائے لے آئی تھی۔ پھر چائے پینے کے بعد ہی وہ جانے کی تیاری کرنے لگی۔ علی کا منہ ہاتھ دھلا کر کپڑے تبدیل کر رہی تھی کہ فراز اس کے پاس آ کر کہنے لگا۔

"رابعہ...... ! میرا خیال ہے۔ اب تم وہاں مت رہو۔"

"کیا......؟" وہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"دیکھو ناں...... ! ایک طرح سے انہوں نے تمہیں اپنے سے خارج ہی کر دیا ہے تو پھر۔"

"نہیں فراز...... ! ایسا نہیں ہے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر کہنے لگی۔ "اس گھر کا کوئی بھی فرد میری ذات سے غافل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بے جی بھی اور پھر میں نے خود وہاں رہنا منظور کیا تھا۔"

قدرے توقف کے بعد فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"وہی میرا گھر ہے اور میں خود سے اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

اس کا دل چاہا کہے گویا انتظار میں ہو کہ وہ خود تمہیں نکالیں۔ لیکن خاموش رہا۔ وہ اسے آزردہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"کیسے جاؤ گی......؟"

"بے جی گاڑی بھجوائیں گی۔" اس کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی۔ "دیکھا۔ وہ مجھ سے غافل نہیں ہیں۔" وہ ہنسا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"جہاں رہو خوش رہو۔"



اس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ کسی اونچی سی جگہ پر کھڑی ہو کر چیخ چیخ کر ساری دنیا کو اکٹھا کر لے اور انہیں فراز کے بارے میں بتائے۔

"میرا بھائی، میرا مان جو برسوں پہلے انتظار کی سولی پر لٹکا گیا تھا۔ اب آ گیا ہے۔"

لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ جب گھر میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے بے جی سے سامنا ہوا۔ وہ انہی سے کہنے لگی۔

"بے جی...... ! آپ کو یاد ہے میرا ایک بھائی بھی تھا جو بچپن ہی میں کہیں چلا گیا تھا۔"

"فراز......!" بے جی نے اس کا نام لیا تو وہ فوراً کہنے لگی۔

"ہاں بے جی...... ! فراز...... وہ آ گیا ہے۔ وہی فراز بے جی جو عاطف کا کزن ہے۔"



اندرونی خوشی کا عکس اس کے چہرے پر اتر آیا تھا اور آنکھیں دمکنے لگی تھیں۔ ایک مدت کے بعد بے جی نے اسے یوں خوش ہوتے دیکھا تھا۔ فوری طور پر مامتا کا جذبہ غالب آیا اور بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"مبارک ہو......" انہوں نے کہا تو اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"کاش ! بے جی...... ! آج امی زندہ ہوتیں تو اسے دیکھ کر کتنی خوش ہوتیں۔"

بے جی نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا اور آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ تھپکنے لگیں۔ اسی وقت خضر حیات آ گئے۔ ان کے لیے یہ منظر واقعی حیران کن تھا۔ آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ بے جی کی نظر ان پر پڑی۔ فوراً رابعہ کو الگ کر کے اسے وہاں سے جانے کے لیے کہا۔ پہلے تو وہ سمجھی نہیں لیکن جب اس نے بھی بابا کو دیکھا تو علی کو اُٹھا کر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی برآمدہ پار کر گئی۔

پھر جس نے بھی سنا، خوشی کا اظہار کیا۔ اور وہ تو تھی ہی بہت خوش۔

فراز اکثر شام میں آ جاتا اور کافی وقت علی اور اس کے ساتھ گزارتا تھا۔ اس کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ صبح یونیورسٹی، دوپہر میں ابا کے پاس چلا جاتا اور انہی کے ناتے اس گھر کی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے بخوبی نبھانا بھی چاہتا تھا۔ شام میں کسی وقت رابعہ کے پاس آ جاتا ورنہ وہی گھر جہاں وہ پروان چڑھا تھا۔

اس دن وہ علی کے ساتھ خاصی اوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہا تھا۔ کبھی اس کے ساتھ فائٹنگ کرتا اور کبھی اس کے چاروں ہاتھ پیر پکڑ کر زور زور سے جھلانے لگتا۔ علی اسی میں خوش تھا اور مسلسل کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک دلچسپی سے دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

"بس کرو...... زیادہ تھک جائے گا تو پھر رات کو نیند میں بھی روئے گا۔"

"میں کیا کروں یہ خود ہی نہیں مان رہا۔" اس نے علی کو فوم پر اچھالا تو وہ پھر کھڑا ہو گیا۔

"ذرا سا ڈانٹ دو۔"

"نہیں بھئی...... یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

"علی......!" اس نے خود ہی علی کو آنکھیں دکھائیں تو وہ جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ پھر وہ اس سے کہنے لگی۔

"[illegible] تم سے بات کرنا چاہ رہی ہوں۔"

"ہاں کہو......!" وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"مجھے یہ بتاؤ......! تمہارے رشتے کی بات کہاں تک پہنچی۔ میرا مطلب ہے [illegible] دوبارہ بے جی کے پاس آئے یا نہیں......؟"

"نہیں......ابھی میں نے خود انہیں روک دیا ہے۔"

"کیوں......؟"

"ابھی میں شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں رابعہ......!" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "پہلے میں اکیلا تھا لیکن اب کچھ ذمہ داریاں میری جھولی میں آن گری ہیں۔ [illegible] شبو اور نمو کی شادی اور میں چاہتا ہوں کمال اور ناصر کو بھی کوئی ڈھنگ کا کاروبار کروا دوں میرا مطلب ہے کوئی جنرل اسٹور وغیرہ......اور پھر تم ہو، تمہیں اس طرح تو نہیں چھوڑ سکتا۔ جب تک [illegible] مسئلوں کو حل نہ کر لوں اپنے بارے نہیں سوچ سکتا۔"

"فراز......! تم نے تو میرا مان بڑھا دیا ہے میرے بھائی تم واقعی بڑے آدمی ہو۔"

"تم ضرور کامیاب ہو گے۔" وہ یقین سے بولی۔ "امی کا خواب ضرور پورا ہو گا۔"

"ہاں......! اور تم گواہ رہنا رابعہ......! کہ اس مقام پر میں امی، اپنے اور تمہارے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا بدلہ لے سکتا تھا لیکن طاقت رکھتے ہوئے بھی میں ایسا نہیں کر رہا اور میں اپنی نیکی کو اپنی امی مہر النساء سے منسوب کرتا ہوں۔" اس کی آواز کا بوجھل پن رابعہ کی آنکھوں کو [illegible] گیلی کر گیا۔

"سنو......!" وہ اس کا ہاتھ تھپک کر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "انکل رحمٰن اور آنٹی [illegible] ملنا چاہتے ہیں اور کئی بار نائلہ بھابی کہہ چکی ہیں کہ میں تمہیں لے کر آؤں۔"

"بے جی سے اجازت لے کر کسی دن چلوں گی۔"

"کسی دن کیوں......؟ کل ہی چلو۔ کل میں یونیورسٹی سے سیدھا یہاں آ جاؤں گا [illegible] ساتھ چلنا۔"

"کل نہیں جا سکوں گی۔"

"کیوں......؟"

"اصل میں کل احتشام بھائی کے بیٹے رضا کی برتھ ڈے ہے۔"

"تمہیں کون سا بے جی اس تقریب میں شریک ہونے دیں گی۔ ان کی نظروں میں تو [illegible] تم......!"

"پھر بھی......" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "میری یہاں موجودگی ضروری ہے۔"

"اچھا......تو پھر جیسے تمہیں سہولت ہو، مجھے بتا دینا۔" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

○ ○ ○

رضا کی سالگرہ کی تیاریاں کئی دنوں سے ہو رہی تھیں، اور آج تو پورا گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ رنگ برنگے قمقمے جلنے لگے تھے۔ نائلہ ابھی تک بے جی سے خفا تھی اور ان ہی کی وجہ سے شام ہی آنا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن احتشام بھائی اور صائمہ بھابی دوپہر ہی میں چلی گئی اور بے جی وہاں سے آئیں تو وہ اٹھ کر ان کے سامنے ہی کمرے سے نکل گئی۔ بے جی دل مسوس کر رہ گئیں، خاموش اس لیے تھیں کہ کہیں خوشی کے موقع پر کوئی بدمزگی نہ پیدا ہو۔ شام میں جب مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اب وہ چپ چاپ رابعہ کے پاس چلی آئی۔

"سب لوگ تمہاری غیر موجودگی کو محسوس کریں گے۔" اسے اطمینان سے بیٹھے دیکھ کر رابعہ کہنے لگی۔

"کرنے دیں......وہاں میری طبیعت گھبرانے لگی تھی۔"

"چائے پیو گی......؟"

"ہاں......! اگر بنانے میں زحمت نہ ہو بلکہ تم بیٹھو، میں بنا لاتی ہوں۔" وہ اُٹھنے لگی تو رابعہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ بٹھا دیا۔

"میں ویسے بھی ابھی چائے بنانے ہی جا رہی تھی۔" اس کے ساتھ ہی کمرے سے نکل گئی۔

کچھ دیر بعد جب وہ چائے لے کر آئی تو اس نے دیکھا۔ نائلہ ہاتھوں میں ایک تصویر لیے ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی۔ حسام کی تصویر ہے جسے ابھی کچھ دیر پہلے وہ خود نہ صرف دیکھ رہی تھی بلکہ اس سے باتیں بھی کر رہی تھی اور نائلہ کے آنے پر اس نے تصویر یونہی تکیے پر رکھ چھوڑی تھی۔

"چائے لو۔" اس نے متوجہ کیا تو نائلہ نے پہلے تصویر تکیے پر رکھی پھر اس کے ہاتھ سے کپ لے لیا۔

"علی کہاں ہے......؟" چائے کا سپ لیتے ہوئے نائلہ پوچھنے لگی۔

"ابھی کچھ دیر پہلے انعام اسے لے کر گیا ہے۔"

"اچھا......!" دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش ہو کر جانے کیا سوچنے لگیں۔

"رابعہ......!" پھر نائلہ نے پکارا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"سنو......! ہمیں اب اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ حسام ہمارے درمیان نہیں رہا۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو تم......!" وہ طویل سانس لے کر بولی۔

"یہی کہ اس کی تصویروں سے اپنے آپ کو بہلانا چھوڑ دو۔"

"میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نائلہ کہ میں اس کی تصویروں کو دیکھوں یا نہ دیکھوں۔ اس کا خیال ہی اتنا زور آور ہے کہ میری ہر سانس مہکتی ہے اور شاید تم یقین نہ کرو، میں اسے اپنے آس پاس محسوس کرتی ہوں۔"

"یہ سراسر خود فریبی ہے رابعہ......!"

"اگر یہ خود فریبی ہے تو مجھے اس میں مبتلا رہنے دو۔ اس سے نکل کر میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔"

"زندہ رہنے کی کوشش کرو۔ آگے زندگی بہت طویل ہے جو کسی سہارے کے بغیر۔"

"حسام نے مجھے بے سہارا و بے آسرا نہیں چھوڑا نائلہ......!" وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً بول پڑی۔ "علی ہے میرے ساتھ۔"

نائلہ کچھ دیر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

"سنو......! اگر میں خود غرضی سے سوچوں تو مجھے تمہاری بات سے خوشی ہوگی کہ چلو تم ساری زندگی میرے بھائی کے نام پر بیٹھ کر اس کے بچے کو پالو گی۔ قصہ ہی ختم۔ لیکن میں خود غرض نہیں ہوں رابعہ......! میرے سامنے تمہاری پہاڑ سی زندگی ہے۔"

"کسی نہ کسی طور کٹ ہی جائے گی۔" وہ یوں بولی جیسے یہ موضوع ختم کر دینا چاہتی ہو۔

"ہاں......! کٹ تو ہر حال میں جاتی ہے۔" نائلہ نے سینے میں دبی سانس ایک آہ کی صورت خارج کی۔

"لیکن زندگی کا ہم پر اتنا حق ضرور ہے کہ ہم اسے بہتر طور پر گزارنے کی کوشش کریں۔ خود ہی سوچو، اگر ہر شخص یہ سوچ کر بیٹھ جائے کہ کٹ تو جاتی ہے تو جدوجہد کا مقصد کہاں باقی رہ جاتا ہے......؟"

"میں نے کہا ناں...... علی جو ہے...... میری جدوجہد اسی کے لیے ہوگی۔"

"اس کوٹھری میں مقید ہو کر اس کے لیے کیا جدوجہد کر سکو گی تم......؟" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"میں اس گھر میں ہوتی نہیں، کل کو صبیحہ بھی چلی جائے گی، احتشام بھائی اپنے بال بچوں میں مصروف اور ایسی ہی مصروفیت انعام کو بھی مل جائے گی۔ باقی رہ جاتے ہیں بابا اور بے جی تو ان

سے تم کیا توقع رکھتی ہو۔" اس کے خاموشی سے دیکھتے رہنے پر کہنے لگی۔

"ابھی انہوں نے تمہیں گھر سے نکال کر اس کوٹھری میں ڈال دیا ہے کل کو یہاں سے نکالیں گے تو۔"

"پلیز نائلہ......! بس کرو۔" وہ رونے لگی۔ "فراز بھی ایسی ہی باتیں کرتا ہے جبکہ میں نے تو سب کشتیاں اپنے ہاتھوں سے جلا ڈالی ہیں۔"

"فراز ٹھیک کہتا ہے اور میں بھی کہہ رہی ہوں کہ اپنے بارے میں سوچو۔"

"مجھے اپنے بارے میں نہیں سوچنا۔" وہ اور شدت سے روتے ہوئی بولی۔

"کوئی ایسا راستہ بتاؤ جس پر میں علی کی انگلی تھام کر چل سکوں۔"

"ابھی علی کو خود تمہاری انگلی تھامنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ۔" اس کی تیز ہوتی سسکیوں میں نائلہ کی آواز دب گئی۔

"تم نے شاید میری بات نہیں سنی۔" نائلہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔

"میں اور چائے بنا کر لاتی ہوں اور سنو......! جب میں واپس آؤں تو تمہیں روتے نہ دیکھوں۔" اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل گئی۔

"اوں ہوں......! رونا مت۔" وہ جو کہیں آس پاس محسوس ہوتا تھا اس کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔

"اب ذرا ہنس کر دکھاؤ تاکہ میں سمجھوں تم یہ کام بخوبی کر سکتی ہو۔"

اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں صاف کیں اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آوازوں کی بازگشت سننے لگی۔ ان آوازوں میں گھر کر اسے اپنا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ نائلہ چائے لے کر آئی تو اسے پتا ہی نہیں چلا۔

"رابعہ......!" اس کے پکارنے پر وہ چونکی اور خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا سوچنے لگی تھیں......؟"

"تم نے سنیں حسام کی سرگوشیاں۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"یہ سب تمہارا وہم ہے اور ان واہموں میں مت گھرو...... لو چائے پیو۔" مگ اس کے ہاتھ میں تھما کر دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تمہیں یہ سب اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ تم نے اپنے آپ کو تنہا کر لیا ہے۔ اس کے خیال کو اپنے آپ پر اتنا طاری مت کرو کہ زندہ لاش بن کر رہ جاؤ۔ باہر نکلو۔ اپنے لیے دوسری دلچسپیاں

تلاش کرو۔ مصروف رہو گی تو اس کی یاد میں اتنی شدت نہیں رہے گی۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"تم بے جی سے ڈرتی ہو ناں تو انہیں ہم کسی نہ کسی طرح سمجھا ہی لیں گے۔ بس تم اپنے دل میں گنجائش پیدا کرو۔ بہت لوگ ہیں جو تمہاری طرف......"

"اس کی بات ہونٹوں میں رہ گئی...... دروازہ بڑی زور سے کھلا تھا...... ساتھ ہی خضر حیات کی اونچی پکار۔

"رابعہ......!" دوسری بار پکارتے ہوئے وہ اندر چلے آئے تو وہ دونوں فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔

"آپ یہاں کیسے آئے......؟" نائلہ پوچھنے لگی۔ کوشش کے باوجود وہ لہجے میں چھپے طنز کو نہ چھپا سکی۔

"اور تم یہاں کیا کر رہی ہو......؟" وہ اس سے پوچھنے لگے۔

"میں رابعہ کے پاس آیا ہوں۔" وہ اسی کے لہجے میں بولے۔

"کیا مطلب......؟" وہ ٹپٹائی اور رابعہ کی طرف دیکھنے لگی جو قدرے خوفزدہ ہو کر باری باری دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"اصل قصہ یوں ہے بیٹا کہ......" وہ آرام سے بیڈ پر بیٹھے، دونوں کے ہاتھ پکڑ کر دائیں بائیں بٹھایا۔ پھر تفصیل بتانے لگے کہ کس طرح انہوں نے بے جی کو آزمایا پھر رابعہ کے حق میں ان کی طرفداری حاصل کرنے کے لیے ناٹک رچایا اور آخر میں اپنے جال میں خود ہی پھنس گئے۔ وہ دونوں حیرت سے سن رہی تھیں۔

"رابعہ......! تم مجھے معاف کر دو بیٹا......!" وہ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "میں بھی ان دنوں ایک پل کے لیے چین سے نہیں رہا۔" وہ ان کی محبت پر رونے لگی۔

"ایک تو تم رونے بہت جلد لگ جاتی ہو۔" نائلہ نے اسے ٹوکا پھر بابا سے پوچھنے لگی۔

"اب آپ کے کیا ارادے ہیں۔"

"ارادے بڑے نیک ہیں۔ "تم دونوں میرے ساتھ چلو۔" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

"کہاں......؟" نائلہ ساری باتیں یہیں جان لینا چاہتی تھی۔

"اپنی بے جی کے پاس۔"

"کیا انہیں معلوم ہے کہ آپ رابعہ کو لے کر آ رہے ہیں۔"

"نہیں...... میں ان کو بتا کر نہیں آیا۔"

"ایسا نہ ہو بابا کہ......"

"جو ہوگا، دیکھا جائے گا...... چلو۔"

وہ مسکرائے اور دونوں کو ساتھ لے کر چل پڑے۔ اس سے قدم نہیں اٹھائے جا رہے تھے، نائلہ کا سہارا لیے جیسے اپنے وجود کو گھسیٹتی جا رہی تھی۔ خوفزدہ بھی بہت تھی۔

"پتہ نہیں، اب کیا ہوگا۔" دل اندیشوں میں گھرا یہی سوچے جا رہا تھا۔

"ڈرنا مت۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" انہوں نے رابعہ کو حوصلہ دیا اور پھر بے جی کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

"صالحہ بیگم......! یہ دونوں لڑکیاں اس خوشیوں بھری محفل سے دور اپنی الگ دنیا بسائے بیٹھی تھیں۔" بے جی کی سوالیہ نظروں کے جواب میں انہوں نے اطمینان سے کہا۔

"نائلہ سے کس نے کہا کہ وہ یہ خوشیوں بھرا ہنگامہ چھوڑ کر جا بیٹھے۔" بے جی اپنی حیرت چھپاتے ہوئے بولیں۔

"نائلہ کا نام لیا آپ نے...... رابعہ کا نہیں۔"

"رابعہ کا ان خوشیوں پر کوئی حق نہیں۔"

"کیوں......؟"

"اس کے نصیب میں جتنی خوشیاں لکھی گئی تھیں، وہ اس نے حاصل کر لیں۔"

"ابھی تو بہت زندگی پڑی ہے اور بہت خوشیاں دیکھنی ہیں اس نے، کیوں رابعہ......!" غضب ہوا جو انہوں نے اسے مخاطب کر لیا۔ رہا سہا حوصلہ بھی جاتا رہا۔ نائلہ سہارا نہ دیے ہوتی تو یقیناً دھڑام سے فرش پر جا گرتی۔

"کیا ہوا بیٹا......!" اس کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھتے ہوئے بابا پریشانی سے پوچھنے لگے۔ وہ بولنے کے قابل کہاں تھی، کھڑی ہلکے ہلکے کانپتی رہی۔

"آپ اسے یہاں کیوں لائے ہیں......؟" بے جی کا غصہ ظاہر ہونے لگا جبکہ وہ سوچ چکے تھے کہ آخری حد تک آرام سے بات کریں گے۔

"کیا اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا......؟"

"نہیں......"

"کیوں......؟"

"میں نہیں چاہتی کہ اس گھر کی خوشیوں پر اس کی نحوست کا ہلکا سا سایہ بھی پڑے۔" اس کے

ساتھ ہی انہوں نے رخ موڑ لیا۔

"صالحہ بیگم ایک بار جب میں نے اسے منحوس کہا تھا تو آپ نے مجھے ٹوکا تھا کہ اس کی دل آزاری ہوگی۔ اب آپ کو اس کی دل آزاری کا خیال نہیں آیا......؟"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ بس اب اسے یہاں سے لے جائیں۔"

"یہ نہیں جائے گی۔"

"کیوں......؟"

"اس لیے کہ میں خود اسے لے کر آیا ہوں۔"

"اور آپ ہی نے اسے یہاں سے نکالا بھی تھا۔" بے جی نے جتانا چاہا۔

"ہاں......! لیکن محض آپ کا ردعمل دیکھنے کے لیے...... میرا خیال تھا آپ مجھے ایسا نہیں کرنے دیں گی لیکن آپ تو جیسے تیار بیٹھی تھیں۔"

"کیا......؟" بے جی نے فوراً پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

"مجھے آپ کے عمل نے دکھ پہنچایا تھا۔" وہ کہنے لگے۔ "اور اگر میں چاہتا تو اسی وقت رابعہ کو لے آتا لیکن میں خاموش رہا کیونکہ آپ سے اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔"

قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

"خدا گواہ ہے جس دن سے رابعہ وہاں منتقل ہوئی ہے، میں ایک پل سکون سے نہیں رہ سکا کیونکہ میں اپنے اس عمل کی بدولت خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گا۔ اور نہ صرف خدا کے سامنے بلکہ حسام کے سامنے بھی۔ ذرا بتایئے تو ہم کیا منہ دکھائیں گے۔ حسام کو کہ اس کے بعد ہم نے اس کی بیوی اور بچے کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔"

بے جی کی نظریں رابعہ پر جا ٹھہریں جو سر جھکائے کھڑی تھی۔

"جب آپ نے اپنا مذہب چھوڑا تو اس سے وابستہ ہر بات آپ کو بھلا دینی چاہیے تھی ورنہ مجھے کہنا پڑے گا کہ آپ نے مجھے اور میرے مذہب کو خلوص نیت سے نہیں اپنایا۔ خود بھی دھوکے میں رہیں اور ہمیں بھی دھوکا دیا۔"

"خضر......! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ......!" بے جی کو دکھ کیسے نہ ہوتا کہ ایک عمر کی ریاضت خاک میں ملائے دے رہے تھے۔

"میں غلط نہیں کہہ رہا۔" ان کا لہجہ اب بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ "ہمارا مذہب بہت وسیع ہے۔ ہر ایک کے لیے اس میں گنجائش ہے۔"

"میں اس سے انکار نہیں کرتی۔"

"انکار نہیں کرتی تو جس خدا پر ایمان لائی ہیں۔ اسی پر بھروسا کرتے ہوئے اس بچی کے سر پر ہاتھ رکھ دیجیے۔ اپنے دل سے یہ خیال نکال دیجیے کہ یہ بیوہ ہے تو منحوس ہوگی۔ ہمارے ہاں نحوست کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ سب زمانہ جاہلیت کی باتیں ہیں۔ یقین رکھیں کہ ہر بات اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس میں انسان کا کوئی دخل نہیں۔"

قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

"حسام اگر اتنی ہی زندگی لے کر آیا تھا تو اس میں رابعہ کا کیا قصور۔ جو اسے اتنی بڑی سزا دے ڈالی۔ ہمارا فرض تھا، اس کی دلجوئی کرنا نہ کہ ایک کونے میں ڈال دینا۔"

بے جی نے سر جھکا لیا۔

"بے جی......! اگر دل میں نیکی کا ذرا سا بھی خیال آئے تو اس پر فوراً عمل کر لینا چاہیے۔"

نائلہ نے لب کشائی کی پھر رابعہ کا ہاتھ دباتے ہوئے کہنے لگی۔

"جاؤ رابعہ......! تم پہلے بڑھ کر بے جی کو معتبر کردو۔"

"آپ میری ماں ہیں بے جی......!" اس کے حلق سے بمشکل آواز نکلی پھر وہ بڑھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

"ارے......!" بے جی دو قدم پیچھے ہٹیں پھر اس کے ساتھ ہی فرش پر گھٹنے ٹیک دیے۔ اگلے پل وہ ان کے بازوؤں میں تھی۔ خضر حیات نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے قریب کھڑی نائلہ کی طرف دیکھا تو وہ ان کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

"بابا......! یہی وقت ہے کوئی اور بات منوانی ہو تو وہ بھی منوا لیجیے۔"

"مثلاً......؟" وہ بھی سرگوشی میں بولے۔

"رابعہ کے مستقبل کے بارے میں۔"

انہوں نے اس کے سر کو بوسا دیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا پھر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔ بے جی اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں خشک کر رہی تھیں جب کہ وہ یہ کام اپنی ہتھیلیوں سے کر رہی تھی۔ اسی وقت انعام، علی کو لیے ہوئے اندر آیا، رابعہ پر نظر پڑی تو پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"میرے خدا......! بھابی آپ یہاں ہیں۔ ہم چچا، بھتیجا پچھلے ایک گھنٹے سے آپ کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اور اب تو میں علی کو یہاں چھوڑ کر مسجد میں اعلان کروانے جا رہا تھا۔"

پھر سب کو اپنی جگہ خاموش کھڑے دیکھ کر وہ صورت حال سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیا ہوا......؟" کچھ نہ سمجھا تو پوچھنے لگا۔
"بھئی......! یہاں ایک گھنٹے کے اندر بڑی زبردست قسم کی تبدیلیاں رونما ہو گئی ہیں۔"
نائلہ کہنے لگی۔
"بے جی اس خوشی کے موقع پر رابعہ کو یہاں لے آئی ہیں اور اب یہ یہیں رہے گی۔" یہاں
نائلہ نے خود بے جی کو معتبر کر دیا۔
"ارے واہ......!" انعام نے خوشی کا اظہار یوں کیا کہ علی کو ہاتھوں میں لے کر اونچا اچھال
دیا۔
"کیا کرتے ہو، گر جائے گا۔" بے جی نے لپک کر علی کو اس سے لے لیا اور بازوؤں میں
بھینچ کر پیار کرنے لگیں۔
"صالحہ بیگم......! اگر اجازت ہو تو اس مبارک موقع پر میں بھی کچھ عرض کروں۔"
خضر حیات یوں بولے جیسے اس سارے واقعے سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ بے جی
کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہنے لگے۔
"میں رابعہ اور انعام کے بارے میں۔"
ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی رابعہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر یوں پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگی کہ سب پریشان ہو گئے۔
"کیا ہوا بیٹا......؟" بے جی نے علی کو بیڈ پر بٹھایا اور اسے کندھوں سے تھام کر پوچھنے لگیں۔
"بے جی......! میرے بارے میں ایسا کوئی فیصلہ مت کیجیے۔ انعام کو ہمیشہ میں نے
چھوٹے بھائی کی طرح سمجھا ہے۔"
"سمجھا ہے سے کیا مطلب؟ میں ہوں ہی آپ کا بھائی۔ لیکن پلیز آپ اس طرح نہ
روئیں۔"
وہ چپ نہیں ہوئی اور نائلہ اپنی جگہ پریشان ہوئی کہ بابا نے انعام کا نام کیوں لیا جب کہ وہ تو
کچھ اور ہی سوچے کھڑی تھی۔ بہر حال اس نے اس وقت اپنی سوچ کو زبان نہیں دی۔ موضوع
بدلتے ہوئے کہنے لگی۔
"میرا خیال ہے سب مہمان آ چکے ہوں گے۔ اب ہمیں بھی باہر نکلنا چاہیے، کیوں بے
جی......! رابعہ کو تیار کر دوں......؟"
بے جی نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ رابعہ کو لے کر اس کے اس پہلے والے کمرے میں آ گئی۔
پھر رابعہ احتجاج ہی کرتی رہ گئی لیکن اس نے اس کی ایک نہیں سنی۔ اپنی مرضی سے اس کے لیے

کپڑوں کا انتخاب کیا۔ ہلکے میک اپ کے بعد کانوں میں ٹاپس اور گلے میں لاکٹ ڈالا۔ پھر اس
کے دراز بالوں کو صرف اوپر سے کلپ میں قید کر کے پیچھے کھلا چھوڑ دیا۔
"نائلہ......!" وہ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پچھلے دو سالوں سے اس نے
ہر چیز اپنے آپ پر حرام کر رکھی تھی۔ اب اپنا ہی روپ اجنبی لگ رہا تھا۔
"میں اس طرح مہمانوں کے سامنے جاؤں گی......؟"
"بالکل......!" نائلہ نے آخری بار اس کے بالوں میں برش کیا۔ پھر اسے کندھوں سے تھام
کر اپنی طرف گھماتے ہوئے بولی۔ "اور خدا کے لیے رابعہ اپنی شکل ٹھیک کرو۔ ذرا سا مسکراؤ، ورنہ
مہمان سمجھیں گے تم انہیں دیکھ کر بیزاری کا اظہار کر رہی ہو۔"
"نہیں تو......" اس کے کہنے پر نائلہ بے ساختہ ہنس پڑی۔
"چلو......! اب سب انتظار کر رہے ہوں گے۔" وہ کچھ جھجکتی ہوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے
سے نکل آئی۔ برآمدے سے اتر کر لان میں داخل ہونے سے پہلے نائلہ اس سے کہنے لگی۔
"اب پلیز میرا ہاتھ چھوڑ دو، ورنہ لوگ سمجھیں گے۔ میں زبردستی تمہیں گھسیٹ کر لا رہی
ہوں۔"
"بس اب اپنی ہدایات بند کرو۔" اس نے جھنجلا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور ذرا سی پلکیں اٹھا
کر دیکھا سب لوگ اسے اپنی طرف دیکھنے لگے۔
"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ سرگوشی میں بولی۔
"بکو مت......" نائلہ نے خود ہی اس کا ہاتھ تھاما اور کھینچتی ہوئی سب کے درمیان لے آئی۔
"رابعہ ہاؤ سویٹ......!" صائمہ بھابھی کی حیرت اور اشتیاق میں ڈوبی آواز۔
"ارے بھابی......!"
صبیحہ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔
"رابعہ......!" احتشام بھائی نے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
"تم میرے لیے کسی طرح بھی نائلہ اور صبیحہ سے کم نہیں ہو۔"
یہ اتنی ڈھیر ساری محبتیں، یہ شہد آگیں لہجے اور تحفظ کا احساس دلاتے اس کے کندھے پر
رکھے ہاتھ۔ دل ڈرا نہیں، نہ ہی خوفزدہ ہوا۔ وقت کے ظالم پنجے نے جو چھیننا تھا، چھین لیا۔ اب وہ
اپنے دامن پر گرفت مضبوط رکھتے ہوئے اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دے گی۔ اب وہ اکیلی نہیں تھی
اور اکیلی تو پہلے بھی نہیں تھی۔ بس ذرا غافل ہو گئی تھی۔ شاید ایک عمر تپتی دھوپ میں چلنے کے بعد شجر
سایہ دار تلے ستانے کو بیٹھی تو کچھ دیر کو آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اور اسی غفلت سے فائدہ اٹھا کر

وقت کا ظالم پنجہ اسے بے سائبان کر گیا تھا۔ اب وہ غافل نہیں ہو گی۔ کبھی نہیں۔

''آؤ رابعہ...... ! سامنے انکل رحمٰن کھڑے ہیں۔ میں تمہیں ان سے ملواؤں۔''

نائلہ نے کہا تو احتشام بھائی نے اس کے کندھے پر دباؤ ڈال کر حوصلہ دیا، وہ مسکرائی اور نائلہ کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

''انکل...... ! یہ رابعہ ہے فراز کی بہن۔'' نائلہ نے کہا تو انکل رحمٰن کے ساتھ ان کی بیگم بھی پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اس نے سلام کیا اور پوچھنے لگی۔

''فراز نہیں آیا...... ؟''

''ہمارے ساتھ تو نہیں آیا۔ ویسے کہہ رہا تھا فارغ ہو گیا تو آ جاؤں گا۔''

''کس کام میں مصروف ہے...... ؟''

''وہ آج شام میں اپنے والد کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جانے والا تھا۔''

''اچھا...... !'' اس نے سر جھکا لیا تو انکل رحمٰن اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

''بیٹا...... ! یہ صحیح ہے کہ ہم نے اسے ہی سب کچھ سمجھ لیا تھا لیکن ہم نے اس بات کے لیے بھی اپنے آپ کو ہمیشہ تیار رکھا کہ وہ کبھی بھی ہم سے جدا ہو سکتا ہے۔''

''نہیں انکل...... !'' وہ فوراً بول پڑی۔ ''وہ آپ سے جدا نہیں ہو گا اور آنٹی۔ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ ہم کبھی اسے آپ سے الگ کرنے کا نہیں سوچیں گے۔'' آنٹی جو خاصی ملول نظر آ رہی تھیں، اس کی بات پر کھل اٹھیں۔

''جیتی رہو بیٹا...... !'' آنٹی نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر کہنے لگیں۔ ''میں اس کی شادی کرنا چاہتی ہوں، پہلے تو وہ تیار تھا لیکن اب پتا نہیں کیوں منع کر رہا ہے۔''

''شادی وہ ضرور کرے گا لیکن اس کا کہنا ہے، پہلے وہ اپنی ذمہ داریاں نبھا لے، اس کے بعد۔''

''یہ تو اچھی بات ہے کہ وہ ایسا سوچ رہا ہے۔'' انکل کہنے لگے۔ ''لیکن بیٹا ہر ماں کی طرح تمہاری آنٹی بھی اب اس کے سر پر سہرا سجانے کی آرزومند ہیں۔ اور پھر بیگم حیات اس کے انتظار میں اپنی بیٹی کو بٹھائے نہیں رکھیں گی۔'' وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم اسے شادی کے لیے آمادہ کرو، ہمارا وعدہ ہے کہ ہم اسے اس کے فرائض سے غافل نہیں ہونے دیں گے۔ تم ہماری بات سمجھ رہی ہو نا...... ؟''

''جی...... !''

''میرا خیال تھا۔ میں آج ہی بیگم حیات سے بات کروں گی۔''

''جیسے آپ مناسب سمجھیں آنٹی...... !'' اور اس کی طرف سے بے فکر رہیں، وہ انکار نہیں کرے گا۔'' اس نے یقین دلایا۔

''صرف ہم نہیں تم بھی ہمارے ساتھ بیگم حیات سے بات کرو گی۔ آخر تو اس کی بہن ہو۔''

اس نے ہنستے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کسی کے پکارنے پر انکل رحمٰن اور آنٹی دوسری طرف متوجہ ہوئے تو وہ ایک دم تنہا ہو گئی۔

نائلہ اور صبیحہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئیں۔ باقی سب لوگ اجنبی تھے۔ وہ اندر جانے کے بارے میں سوچنے لگی۔ کن انکھیوں سے دیکھا۔ راستے میں کافی مہمان کھڑے تھے۔ ان کے درمیان سے گزر کر جانا اچھا نہیں لگا اس لیے ان کے ہٹنے کا انتظار کرنے لگی۔

اچانک اسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنے پورے وجود سمیت کسی کی نظروں کی گرفت میں آ گئی ہو۔ رُخساروں پر تپش کا احساس ہونے لگا اور پلکیں باوجود کوشش کے اٹھائی نہ گئیں۔

''جانے کون ہے...... ؟''

''اس نے سوچا اور بالکل غیر محسوس طریقے سے اپنا رخ موڑ کر باڑ میں لگے رنگ برنگے قمقموں کو دیکھنے لگی۔ جلتے بجھتے قمقموں کا عکس اس کی آنکھوں میں بھی لہرانے لگا تھا۔

''رابعہ...... ! یہ واقعی آپ ہیں۔''

''اسے اپنے عقب سے آواز سنائی دی۔ گو کہ شناسائی زیادہ نہیں تھی پھر بھی اس آواز کو پہچان گئی۔ دل کچھ اس انداز سے دھڑکنے لگا تھا کہ فوراً ان کی طرف پلٹ بھی نہ سکی۔

''آپ کی یہاں موجودگی حیران کن ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ خوشی کا باعث......''

''اس نے بمشکل اپنے آپ پر قابو پایا اور پلٹ کر بہت خاموش نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''یہی زندگی ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ ''اپنے ساتھ ہونے والے حادثات کو فراموش کر دینا ہی اچھا ہے۔ ورنہ زندگی کی دشواریاں کبھی کم نہیں ہوتیں۔''

''حادثات فراموش نہ بھی کیے جائیں ڈاکٹر آصف...... ! تو بھی وقت کی گرد انہیں دھندلا ضرور دیتی ہے لیکن ان کے جو نشان دل پر نقش ہو جاتے ہیں، وہ مٹائے نہیں مٹتے۔''

وہ شاید انہیں باور کرانا چاہتی تھی کہ ان کا جو قدم جہاں ہے، وہیں روک لیں۔ اس سے آگے بڑھنے کی نہ وہ اجازت دے گی اور نہ ہی پذیرائی کرے گی۔

"میں آپ کے دل پر نقش کسی بھی حادثے یا محبتوں کے نشان مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کروں گا۔ ہاں البتہ ہاتھ تھامنے کی جسارت ضرور کروں گا۔"

"میرے خدا......!" وہ دھڑکتے دل کے ساتھ دو قدم پیچھے ہٹی۔ راستے پر نظر ڈالی۔ وہاں اب بھی مہمان کھڑے تھے۔ لیکن وہ رکی نہیں سب کے درمیان میں سے راستہ بناتی ہوئی وہاں سے نکل آئی۔ ڈاکٹر آصف جہانگیر نے وہیں کھڑے رہ کر اسے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے دلچسپی سے دیکھا۔

اس کے بند دروازے پر دستک دینے کا فیصلہ تو انہوں نے اول روز ہی کر لیا تھا اور اب سوچ رہے تھے، دستک دینے میں محض وقت کا زیاں ہے انہیں براہ راست اندر داخل ہو جانا چاہیے۔

پھر کیک کاٹنے کی رسم ہال کمرے میں ادا کی گئی۔ اس کے بعد کھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ نائلہ، صبیحہ اور صائمہ بھابی کے ساتھ وہ بھی میزبانی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ کافی مہمان کھانا کھاتے ہی رخصت ہونے لگے تھے۔ وہ کسی کام سے باہر آئی تو اس کی نظر فراز پر پڑی جو عاطف کے ساتھ برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ وہ لپک کر اس کے پاس آئی۔

"تم نے آنے میں اتنی دیر کر دی......؟" جواب دینے کے بجائے فراز حیران ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"کیا دیکھ رہے ہو......؟" وہ ٹپٹائی۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم یہاں موجود ہو تو میں سر شام ہی آ جاتا۔"

"مجھے یہیں ہونا تھا۔" وہ اعتماد سے بولی۔

"ہاں......! تمہارا مقام یہیں ہے۔" وہ ایک قدم میں دو سیڑھیاں پھلانگ کر اس کے برابر آ کھڑا ہوا۔

"یہ تو اب بھی نہیں آ رہا تھا۔" عاطف کہنے لگا۔

"انکل رحمٰن نے فون کیا ہے تب آیا ہے۔"

"تم ابا کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے......؟" وہ پوچھنے لگی۔

"ہاں......! اور وہاں سے تو میں جلدی فارغ ہو گیا تھا۔"

"پھر یہاں آنے میں دیر کیوں کی۔" پھر خود ہی کہنے لگی۔ "خیر چھوڑو...... اصل بات یہ ہے کہ انکل رحمٰن، آنٹی اور میں تمہارے سلسلے میں بے جی اور بابا سے بات کر رہے ہیں۔"

"لیکن رابعہ......!" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ بول پڑی۔

"لیکن ویکن چھوڑو۔ آنٹی کی یہی خواہش ہے اور تمہیں ان کی خواہش رد نہیں کرنی چاہیے۔"

"میں ان کی خواہش رد نہیں کر رہا لیکن مجھے کچھ وقت چاہیے۔"

"یہی مناسب وقت ہے اور باقی کام بھی اپنے مقررہ وقت پر ہو جائیں گے جب خدا کو منظور ہو گا کیا سمجھے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔"

"بس سب ٹھیک ہے۔" وہ اس کے لیکن کہنے سے پہلے ہی بول پڑی۔ پھر ہنستے ہوئے عاطف کی طرف دیکھا اس نے بھی تائید کی۔

"گویا یہاں محاذ بن چکا ہے۔" وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔

"دونوں بہن بھائی کے خلاف۔" عاطف نے کہا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب......؟"

"مطلب سمجھانے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے آؤ فراز......!" وہ فراز کے بازو میں بازو ڈال کر تقریباً کھینچتا ہوا اندر کی طرف چلا گیا اور وہ بس کچھ دیر کو ہی اس کی بات کو سوچ سکی تھی کہ نائلہ کے پکارنے پر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

پھر جب سب مہمان رخصت ہو گئے۔ تب انکل رحمٰن اور آنٹی نے بے جی کو گھیر لیا۔ انکل رحمٰن کے اشارے پر وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ تھی۔ بابا اور احتشام بھائی تو پہلے ہی راضی تھے اور اعتراض تو بے جی کو بھی نہیں تھا بس یہ بات کہ فراز، رحمٰن صاحب کا بیٹا نہیں ہے ان کے دل میں کھٹکتی تھی اور اب تو یہ کھٹک بھی نہیں رہی تھی۔

برسوں پہلے انہوں نے مہر النساء سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے بعد ان کی اولاد کے سر پر ہاتھ رکھیں گی۔ اور دست شفقت تو انہوں نے اسی وقت بڑھایا تھا جب مہر النساء نے اس دنیا سے ناتا توڑا تھا۔ لیکن فراز اس سائے سے خود ہی دور چلا گیا۔ اور رابعہ کو زرینہ بیگم نے ان کے پاس آنے نہیں دیا تھا اور اب وقت اور حالات نے ایک بار پھر ان دونوں کو ان کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ اب وہ روایتوں پر اڑنے والی عورت نہیں رہی تھیں۔ اب صرف ممتا کا جذبہ جو گزشتہ دو سالوں میں رابعہ کو روایتوں کی بھینٹ چڑھا کر بھی کئی بار ان پر غالب آیا تھا کہ اسے کھانے میں سب کے ساتھ شریک نہ کر کے بعد میں ہدایت ضرور کرتیں۔

"آرام اور اطمینان سے بیٹھ کر کھا لو۔"

علی چارپائی سے گرا تو کمرے میں ڈبل بیڈ کے ساتھ ساتھ کارپٹ بھی بھجوا دیا۔ یہ ان کی محبت ہی تھی کہ اس سے غافل ہو کر بھی غافل نہیں رہیں۔ اور اب تو غفلت کے اندھیرے مکمل طور پر چھٹ چکے تھے۔

"تم شاید دو کشتیوں میں سوار ہو......؟" ایک بار خضر حیات نے کہا تھا۔

"نہیں......" انہوں نے سختی سے تردید کی تھی۔ "تمہاری کشتی میں پاؤں رکھتے ہی میں نے اپنی کشتی کو وہیں چھوڑ دیا تھا اور پھر اسے ڈوبتے ہوئے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تم گواہ ہو خضر......! گواہ رہنا۔"

اور اب صرف خضر حیات گواہ نہیں تھے۔ ان کے ساتھ باقی سب نے بھی دیکھا کہ بے جی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر رابعہ اور فراز دونوں کو ایک ساتھ بازوؤں میں لے لیا تھا۔

"تمہاری رگوں میں اس عظیم عورت کا خون دوڑتا ہے جو خود ایک جوان بیٹے حق نواز کے ہوتے ہوئے بھی بے سہارا تھی۔ اس نے ہمیں سہارا دیا۔ اس وقت جب ہم نے اس سرزمین پر قدم رکھا اور یہاں ہمارا کوئی نہیں تھا۔ پھر مہر النساء جس کا خمیر ایثار اور وفا کی مٹی سے گندھا تھا تم دونوں اس جیسا صبر اور عزم لے کر پیدا ہوئے ہو۔ میری کوتاہیاں میری غلطیاں معاف کر دو، میرے بچو......!"

بے جی کی آواز بھرا گئی تو اس نے تڑپ کر ان کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

"آپ ہماری ماں ہیں بے جی......! اور مائیں غلطیاں نہیں کرتی۔ بس اولاد کو عملی زندگی میں ثابت قدمی سکھانے کے لیے انہیں اپنا رویہ تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ اور آپ نے ایسا کیا تو کیا برا کیا۔ یہی ہمارے حق میں بہتر تھا۔"

"رابعہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" ماحول میں جو سنجیدگی اور بوجھل پن اتر آیا تھا۔ اسے دور کرنے کی خاطر خضر حیات نے بڑھ کر رابعہ کو بے جی سے الگ کیا پھر اونچی آواز میں نائلہ سے کہنے لگے۔

"نائلہ......! اب اس گھر میں رشتے ناتے کیا بغیر مٹھائی کے طے ہوا کریں گے......؟"

"نہیں تو بابا......!" وہ فوراً بولی۔

"تو جاؤ......! مٹھائی کے ساتھ ساتھ اچھی سی چائے کا بھی انتظام کرو۔"

"جی بہتر......!" وہ جانے لگی تو رابعہ کو بھی اپنے ساتھ لیتی گئی۔

"سنو......! اگر برا نہ مانو تو میں ذرا علی کو دیکھ آؤں۔" وہ کچن میں نائلہ سے بولی۔

"کہاں ہے علی......؟"

"صبیحہ کے پاس ہے۔"

"بالکل جاؤ بلکہ اب تم صبیحہ کے پاس ہی رہنا۔"

"کیوں......؟"

"بس ہے ایک بات......!"

"کون سی بات......؟" نائلہ جواب دیے بغیر کچن میں چلی گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے جانا چاہتی تھی لیکن پھر پلٹ کر علی کو دیکھنے چل دی۔

علی، صبیحہ کے پاس سو رہا تھا۔ اس نے پہلے صبیحہ کو مبارکباد دی پھر علی کے بارے میں پوچھنے لگی کہ تنگ تو نہیں کر رہا۔

"میرا خیال ہے اسے بھوک لگی ہے جو یہ بار بار اپنا انگوٹھا منہ میں لے رہا ہے۔" صبیحہ نے کہا تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"میرے خدا......! اسے فیڈر دینا تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ اور فیڈر بھی وہیں کوارٹر میں رکھی ہے۔"

"اب تو سو رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں سوتے میں پی لے گا۔ ٹھہرو، پہلے میں اس کی فیڈر لے آؤں۔"

وہ جلدی سے نکلی اور تقریباً بھاگتی ہوئی درمیانی راستہ طے کر کے کوارٹر میں آئی۔ فیڈر کے ساتھ علی کی کچھ ضروری چیزیں بھی اس نے باسکٹ میں رکھیں اور جیسے ہی کمرے سے نکلنے لگی، ٹھٹک کر رک گئی۔

بیرونی دروازے سے آصف جہانگیر داخل ہو رہے تھے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ فوراً پلٹ کر دوبارہ کمرے کے اندر آ گئی۔

"میرے پاس دستک دینے کے لیے وقت نہیں ہے، اس لیے میں براہ راست اندر چلا آیا۔" کچھ دیر بعد وہ اسی جگہ کھڑے تھے جہاں سے وہ پلٹی تھی۔

"وہ میں......فیڈر......علی کی......" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ رک رک کر بس یہی لفظ کہہ سکی۔

"میں جانتا ہوں، آپ یہاں کسی کام سے ہی آئی ہوں گی اور میں بھی اپنی ایک بات کا جواب لینے آیا ہوں۔" اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہنے لگے۔

"یاد ہے......میں نے آپ کے ہاتھ بے جی کو ایک پیغام بھجوایا تھا کہ جس دروازے پر میں آپ کو چھوڑ رہا ہوں کسی دن اسی دروازے سے لینے بھی آؤں گا۔"

"آصف پلیز......!" اس نے رخ موڑ لیا۔ اور وہ قدم بڑھا کر اس کے قریب آ کھڑے ہوئے۔

"اپنی ذات سے نظریں چرانا حماقت ہے رابعہ۔ یہ بات آپ سمجھتی نہیں یا سمجھنا نہیں چاہتیں؟" اسے کچھ خوفزدہ سے انداز میں دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے۔

”سب سے پہلے تو اپنے دل سے یہ خوف نکال دیجیے کہ سب لوگ کیا کہیں گے۔ کیونکہ میں
سب کی اجازت سے ہی یہاں تک آیا ہوں، البتہ بے جی۔“

”کیا......؟“ وہ ان کی پوری بات سنے بغیر متعجب سی ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی اور وہ
بے جی کا ذکر گول کرتے ہوئے بولے۔

”ہاں......! اور سب کا خیال ہے کہ یہ پہاڑ سی زندگی بغیر کسی ساتھی کے نہیں گزاری جا
سکتی۔“

”میں سب کے خیال کی نفی نہیں کروں گی، لیکن آپ سب یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں اکیلی
نہیں ہوں۔ علی میرے ساتھ ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں، لیکن کیا خود آپ کو علی کا خیال نہیں ہے۔ ابھی وہ چھوٹا ہے اور زیادہ
وقت نہیں گزرے گا، جب وہ آپ سے سوال کرنے لگے گا۔ کب تک اور کہاں تک مطمئن کریں گی
اسے، اور اگر اس کے علاوہ کوئی خدشہ ہے تو میرا یقین کریں رابعہ کہ آپ کے بارے میں سوچتے
ہوئے میں نے کبھی علی کو نظر انداز نہیں کیا۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

”میرا ظرف اتنا چھوٹا نہیں ہے کہ دل میں ایک بچے کے لیے گنجائش پیدا نہ ہو، اگر مزید
آزمائش مطلوب ہو تو یہ یقین دلا دوں کہ میں صرف علی کا باپ بنوں گا۔ اس کے بعد کسی کا نہیں۔“

”میرے خدا......!“ وہ منجمد سی ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگی جو ان کے لہجے کی صداقتوں کی
امین تھی اور وہ کہنے لگے۔

”ابھی کچھ عرصہ پہلے آپ نے کہا تھا کہ زندگی میں ہونے والے حادثات کو وقت کی گرد
دُھندلا ضرور دیتی ہے، لیکن ان کے جو نشان دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔ وہ مٹائے نہیں مٹتے تو اس
بارے میں بھی میں آپ کو یقین دلا دوں کہ آپ کے دل پر نقش نشان خواہ وہ کسی حادثے کے ہوں یا
کسی کی محبتوں کے۔ میں انہیں مٹانے کی کوشش نہیں کروں گا اور نہ ہی مٹا دینے پر اصرار۔ ہاں یہ
یقین ضرور ہے کہ جس طرح حادثات کو وقت کی گرد نے دھندلایا ہے اسی طرح میری محبتیں ان
نشانوں کو دھندلا دیں گی۔“ اس کے خاموشی سے سر جھکانے پر کہنے لگے۔

”لیکن ایک بات یاد رہے رابعہ......! کہ آپ کا دل میرے نام پر دھڑکنے لگے تو پوری
ایمانداری سے اعتراف کیجیے گا۔“

اس کی پیشانی کو اپنی شہادت کی اُنگلی سے چھو کر اس کا سر ذرا سا اُونچا کرتے ہوئے کہنے
لگے۔

”اوں ہوں......! رونا نہیں ہے۔ گزشتہ ماہ و سال میں جو موتی لٹا چکی ہیں، انہیں ہی بہت

بچھ لیں اور اب صرف ہونٹوں کی کلیاں چٹخنے دیں۔“ بالکل غیر ارادی طور پر وہ پلکیں جھپک جھپک
کر ساری نمی اپنے اندر اتارنے لگی۔

”گڈ......!“ وہ ہلکے سے مسکرائے اور اپنا مضبوط ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔

”جب میں یہاں آ رہا تھا تو سب نے میری کامیابی کی دعا کے ساتھ اس خواہش کا اظہار کیا
تھا کہ واپسی میں آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہو۔ سب کا کہنا تھا کہ بقیہ زندگی بنا ساتھی کے کٹنی
دشوار ترین ہوگی۔“ اس حقیقت سے وہ خود بھی انکار نہیں کر سکتی تھی اور اب جب کہ سامنے کھڑا شخص
نہ صرف اسے بلکہ اس کے بچے کو بھی پورے خلوص سے سائبانی مہیا کر رہا تھا تو اسے نظریں نہیں
چرانی چاہئیں۔ ہوسکتا ہے کل جب وہ خود ساتھی کی ضرورت محسوس کرے تو ایسا مخلص اور محبت
کرنے والا کہیں نہ ملے۔

”رابعہ......!“ محبتوں سے چور لہجے نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور اس نے بہت
آہستگی سے اپنا نازک سا ہاتھ ان کے مضبوط ہاتھ پر رکھ دیا جسے فوراً ہی انہوں نے اپنی گرفت میں
لے لیا تھا۔

اسی طرح ان کے ساتھ چلتی ہوئی وہ اندر آئی۔ ہال کمرے کا ماحول خاصا خوشگوار تھا۔ چائے
کے دوران سب بہت اچھے موڈ میں باتیں کر رہے تھے ان دونوں کو ساتھ داخل ہوتے ہوئے سب
نے دیکھا۔ اس نے اپنے جھکے ہوئے سر کو ذرا سا اونچا کر کے سامنے نظر ڈالی۔ نائلہ مسکراتے
ہوئے سر ہلا رہی تھی۔ اس نے جھینپ کر نظروں کا زاویہ بدلا اور کھلتے چہروں پر سے ہوتی ہوئی اس
کی نظریں بے جی پر ٹھہریں تو لمحہ بھر کو اس کے پورے وجود میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ان کی پیشانی پر
ناگواری کی لکیریں واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔

”رابعہ......! میرے پاس آ کر بیٹھو۔“ پتا نہیں بے جی کا لہجہ واقعی چبھتا ہوا تھا یا اسے
محسوس ہوا تھا۔ اس کے سینے میں سانس رکنے لگی اور بے جی کی طرف قدم بڑھایا تو لمحہ بہ لمحہ
ڈاکٹر آصف جہانگیر سے دور ہوتی چلی گئی گو کہ اپنی پشت پر ان کی حوصلہ دیتی نظروں کی تپش
صاف محسوس کر رہی تھی، پھر بھی دل میں کچھ اندیشوں اور کچھ خوف نے گھر کر ہی لیا تھا۔ بے جی
کے پاس بیٹھی تو یاد آیا کہ ڈاکٹر آصف، بے جی کے بارے میں کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے اس
نے سوچا، اگر وہ وہیں جان لیتی تو اس طرح ان کے ساتھ چلتی ہوئی سب کے درمیان میں نہ
آتی۔ بے جی نے بات کرتے ہوئے یونہی اپنا ہاتھ اس کی کلائی پر رکھ دیا تھا۔ وہ چونکی اور پھر
ذہن سے ہر خیال جھٹکتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرنے لگی کہ یہاں کس موضوع پر بات ہو
رہی ہے۔

آنٹی اور انکل رحمٰن، بے جی اور بابا پر زور دے رہے تھے کہ اسی ہفتے فراز اور صبیحہ کا نکاح کر دیا جائے۔

''ارے......! یہاں بات پکی ہو کر نکاح تک آ پہنچی ہے اور مجھے خبر ہی نہیں۔'' اس نے سوچا اور پوری طرح متوجہ ہو گئی۔

''ابھی صرف نکاح ہی کر دیں، رخصتی جب آپ کہیں گی، تب کر لیں گے۔'' آنٹی کی بات پر بے جی کہنے لگیں۔

''اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا......؟''

''بات فائدے نقصان کی نہیں ہے، بیگم صاحبہ......!'' انکل رحمٰن کہنے لگے۔

''ایک مدت سے ہمارے گھر میں کوئی خوشگوار ہنگامہ نہیں جاگا، بس اسی بہانے ہم اپنے گھر میں رونقیں دیکھنا چاہتے ہیں اور پھر جب بات پکی ہو گئی ہے تو ہماری خواہش بھی پوری کر دیجیے۔''

''مان لیجیے بے جی......!'' وہ بے اختیار بے جی کا ہاتھ تھام کر لجاجت سے بولی۔

''انکل اور آنٹی اتنا اصرار کر رہے ہیں اور پھر مجھے بھی مدتوں بعد بھائی ملا ہے تو......؟''

''چلو بھئی......! رابعہ کہہ رہی ہے تو ہمیں منظور ہے۔'' بابا نے فوراً فیصلہ سنا دیا تو وہ ایک دم خوش ہو گئی پھر دن اور تاریخ طے کرنے کے بعد سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

بے جی اور بابا نے سب کو وہیں سے رُخصت کیا جب کہ وہ احتشام بھائی اور صائمہ بھابی کے ساتھ باہر تک آئی۔

''فراز......!'' سب روش پر آگے تک چلے گئے تو وہ فراز کا ہاتھ پکڑ کر وہیں رکتے ہوئے بولی۔

''صبح سب سے پہلے ابا اور اماں کو جا کر بتانا۔ انہیں تمہاری خوشی میں شریک ہونا ہے۔''

''بالکل......! ان کے بغیر تو کوئی کام نہیں ہوگا۔'' فراز نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔

''اور سنو......! کل میں تمہیں لینے آؤں گا۔''

''کیا مطلب......؟''

''دیکھو ناں......! کل پانچ دن ہیں اور یہ دن تم ہمارے ساتھ رہنا، کیا تمہاری خواہش نہیں ہے کہ تم تیاری میں آنٹی کا ہاتھ بٹاؤ۔''

''ہاں......! کیوں نہیں۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہر بات اور ہر چیز میں تمہاری پسند شامل ہو۔''

''میں بے جی سے بات کروں گی۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔

''کیا بے جی منع کریں گی......؟''

''نہیں منع تو نہیں کرنا چاہیے، ہم اتنے عرصے بعد ملے ہیں۔ میں کچھ وقت تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اور اس سے اچھا موقع اور کون سا ہوگا بھلا......؟''

''ہاں......! اور ایسے موقع بار بار بھی نہیں آتے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''خیر......! تم فکر مت کرو، بے جی منع نہیں کریں گی۔'' پھر اس کے ساتھ چلتی ہوئی سب کے ساتھ آملی۔

''او کے......رابعہ......!''

نائلہ اس کے گلے لگی پھر عاطف اور ڈاکٹر آصف کے ساتھ گاڑی میں جا بیٹھی اور فراز انکل رحمٰن اور آنٹی کے ساتھ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے کچھ دور تک انہیں جاتے ہوئے دیکھا پھر احتشام بھائی اور صائمہ بھابی کے ساتھ اندر آگئی۔ پہلے وہ ہال کمرے میں آئی۔

''چائے کے برتن اسی طرح رکھے تھے اور دیر ہو جانے کی وجہ سے ملازم بھی شاید چلا گیا تھا۔ اس نے خود ہی برتن سمیٹنے شروع کر دیے۔

جب وہ برتن اُٹھا کر کچن کی طرف جا رہی تھی تو بے جی کے کمرے سے ان کی اور بابا کی آواز اسے باہر تک سنائی دی۔ گو کہ وہ بہت اونچی آواز میں نہیں بول رہے تھے، لیکن خاموشی اور رات ہونے کی وجہ سے آوازیں کچھ گونجتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ اس کا ادھر متوجہ ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، لیکن اپنا نام سن کر تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہیں رک گئی۔

''آج رابعہ کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔'' بے جی کہہ رہی تھیں۔

''اور مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ اتنا عرصہ اسے زندگی سے دور رکھ کر میں نے اچھا نہیں کیا۔ بہرحال اب وہ اس گھر میں اسی طرح رہے گی، جیسے ہم سب رہتے ہیں لیکن حیات......!'' بے جی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں۔

''یہاں تک تو سب ٹھیک ہے، لیکن اس سے آگے آپ لوگ جو کچھ اس کے لیے سوچ رہے ہیں، وہ میرے لیے دکھ اور تکلیف کا باعث ہے۔''

''کیا مطلب......؟'' بابا پوچھنے لگے۔

''آپ لوگ اسے ڈاکٹر آصف کے ساتھ منسوب کرنے کا سوچ رہے ہیں ناں تو یہ کسی طرح ممکن نہیں۔''

''کیوں ممکن نہیں ہے، کیا آپ کو ڈاکٹر آصف پسند نہیں......؟''

''ڈاکٹر آصف ہو یا کوئی اور، اس لحاظ سے مجھے کوئی بھی پسند نہیں ہوگا۔ وہ میری بہو ہے خضر......! میرے پوتے کی ماں۔''

''صالحہ......!'' خضر حیات شاید انہیں شام کے لمحوں کی باتیں یاد دلانا چاہتے تھے، انہوں نے ٹوک دیا۔

''بس خضر......!'' اس بات کو یہیں ختم کردیں، میں حسام کی جگہ کسی اور کو نہیں دیکھ سکتی اور یہ بات آپ رابعہ کو بھی سمجھا دیجیے گا۔''

''وہ بابا کا جواب سننا چاہتی تھی، لیکن ان کی خاموشی طویل ہوگئی تھی اور وہ ہاتھوں میں ٹرے اُٹھائے اُٹھائے تھک گئی تو بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی کچن میں آگئی۔

اسے بے جی کی باتوں نے دُکھ نہیں پہنچایا تھا، لیکن پھر بھی کوئی بات تھی، جس نے اسے بے چین کردیا۔ اپنی کیفیت کو وہ خود نہیں سمجھ سکی۔ کوئی خیال نہیں کوئی سوچ نہیں پھر بھی بے چینی اس قدر کہ دو تین بار چولہا جلایا اور بجھا دیا۔ کیبنٹ کھولے اور بند کیے۔

''کیا کھو گیا ہے......؟'' دل کی سرگوشی میں رازداری تھی۔

''پتا نہیں......'' بے بسی سے سر جھٹکا اور اندر چلی آئی۔ علی اور اس کے ساتھ صبیحہ بے خبر سو رہے تھے۔ وہ علی کو اٹھانے کے بجائے وہیں صوفے پر لیٹ گئی۔ کچھ دیر تک وہ اپنے ساتھ ہونے والی اچانک تبدیلی کو سوچتی رہی پھر نیند آگئی۔

اگلے دن جب فراز اسے لینے آیا، اس وقت تک اس نے بے جی سے بات نہیں کی تھی۔ نہیں تھا کہ اسے یاد نہیں تھا۔ یاد تو تھا، لیکن اس نے سوچا، پتا نہیں بے جی انکل رحمٰن کے گھر رہنے کی اجازت دیں گے یا نہیں، لیکن بے جی نے بخوشی اجازت دے دی۔

''اس خوشی پر سب سے زیادہ تمہارا حق ہے بیٹی! میں تمہیں نہیں روکوں گی۔''

اور جب وہ آرہی تھی تو بے جی اس سے کہنے لگیں۔

''رحمٰن صاحب کے گھر اور لوگوں کا آنا جانا بھی رہے گا، بس تم ذرا محتاط رہنا۔''

اس نے یونہی سر ہلا دیا تھا، لیکن جب انکل رحمٰن کے گھر اس نے ڈاکٹر آصف کو دیکھا تب وہ سمجھی کہ یقیناً بے جی کا اشارہ انہی کی طرف تھا۔

''میں بے جی کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی۔'' اس نے سوچا۔

''اگر وہ ایسا نہیں چاہتیں تو میں بھی ایسی کسی سوچ کو دل میں جگہ نہیں دوں گی۔''

انکل رحمٰن اور آنٹی نے اس کی آمد پر بہت خوشی کا اظہار کیا۔ آنٹی نے یہاں تک کہا کہ آج

مجھے اپنا گھر مکمل نظر آرہا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے میری بیٹی کہیں دور سے اپنے بھائی کی شادی میں شریک ہونے آئی ہو۔

انکل رحمٰن ڈاکٹر آصف کے ساتھ پروگرام طے کررہے تھے۔ فراز بھی ان کے ساتھ شامل ہوگیا اور وہ علی کو اٹھا کر آنٹی کے ساتھ ان کے کمرے میں آگئی۔ پھر اس وقت تک وہ وہاں سے نہیں نکلی جب تک اسے ڈاکٹر آصف کے جانے کا یقین نہیں ہوگیا، لیکن وہ کب تک ان سے دامن بچاتی۔

یہ ان کے چچا کا گھر تھا اور ایسا موقع تھا کہ وہ صبح شام یہاں آرہے تھے اور کیونکہ انکل رحمٰن زیادہ انہی پر بھروسا کیے ہوئے تھے، اس لیے رات دیر تک وہ یہیں موجود رہتے۔

پہلے دو دن تو ان سے سامنا ہوا بھی تو وہ کترا کر نکل گئی، لیکن تیسرے دن وہ راستہ روک کر کھڑے ہوگئے۔

''یہ گریز کیوں......؟'' وہ پوچھ رہے تھے اور اس کے پاس جواب نہیں تھا، اس لیے راہِ فرار ڈھونڈنے لگی۔

''اس روز کی میری تمام باتوں کو شاید آپ نے کسی دیوانے کی......''

''نہیں ڈاکٹر آصف......!'' وہ فوراً بول پڑی۔

''پھر اس بے نیازی کو میں کیا سمجھوں......؟''

''سمجھنا ضروری ہے کیا......؟''

''کوئی نام تو ہو۔''

''بے نام ہی رہنے دیں۔'' وہ جانے کو تھی کہ اس کا ارادہ بھانپ کر انہوں نے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ڈاکٹر آصف......! پلیز...... سمجھنے کی کوشش کریں۔''

''آپ سمجھائیں گی، تب سمجھوں گا نا۔'' وہ اس کے اچنبھے پر محظوظ ہو کر بولے۔

''انکل یا آنٹی میں سے کوئی آگیا تو پتا نہیں کیا سمجھیں۔''

''سب سمجھتے ہیں، بس ایک آپ نہیں سمجھ رہیں۔''

''میں کچھ سمجھنا نہیں چاہتی پلیز......!'' وہ رو دینے کو ہوگئی تو چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

''رابعہ......!'' وہ پہلے حیران ہوئے پھر پریشان اور پھر بڑھ کر اس کی کلائیاں تھامتے ہوئے ہاتھوں کو چہرے سے ہٹا دیا۔ وہ رو رہی تھی۔

''کیا بات ہے......؟'' وہ نرمی سے پوچھنے لگے۔

"کیا میری ذات آپ کے لیے کسی پریشانی کا سبب بنی ہے......؟"

"نہیں......!"

"پھر......؟"

"بس آپ میرے لیے سوچنا چھوڑ دیں۔ میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔"

"آپ بے جی سے ڈرتی ہیں۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔

"میں ان کا احترام کرتی ہوں اور ان کی کسی بات کو رد نہیں کر سکتی۔ ان کی سوچ غلط نہیں ہے، اگر ان کی جگہ میں ہوتی تو میرے احساسات بھی ایسے ہوتے۔"

"مجھے بتائیں...... بے جی نے آپ سے کیا کہا......؟"

"بخدا انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔"

"پھر......؟"

"وہ بابا سے باتیں کر رہی تھیں، بس اتفاق سے میں نے سن لیں۔"

پھر ان کے اصرار پر اس نے ساری باتیں کہہ سنائیں، آخر میں کہنے لگی۔

"ڈاکٹر آصف......! بے جی نے مجھے اس گھر میں دوبارہ وہی مقام دے دیا ہے، اب اور کچھ نہیں چاہیے مجھے۔"

"دوبارہ وہی مقام......؟" انہوں نے تلخی سے کہا اور اسے وہیں چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے۔

پھر وہ مزید دو دن وہاں رہی۔ اس دوران کئی بار ان سے سامنا ہوا، لیکن انہوں نے پھر اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی، لیکن جن نظروں سے دیکھتے تھے، اس سے اس کے اندر آزردگی سمٹنے لگتی تھی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ اس خوشی کے موقع پر اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے کہ وہ ڈھنگ سے خوشی کو محسوس ہی نہیں کر رہی۔

بالآخر وہ گھڑی بھی آ گئی، جس کا ہر بہن شدت سے انتظار کرتی ہے۔ فراز دولہا کے روپ میں سامنے آیا تو وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

"بھائی......! اللہ تمہیں ہر بد نظر سے محفوظ رکھے۔" وہ اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولی۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے اتنی بڑی خوشی بھی نصیب ہو گی۔"

"بے وقوف......! تمہارے نصیب میں تو ابھی ڈھیروں خوشیاں ہیں۔" فراز اسے اپنے ساتھ لگائے ہوئے باہر تک آیا اور گاڑی میں بھی اپنے ساتھ بٹھایا۔ دوسری طرف آنٹی تھیں اور انکل رحمٰن نے ابا کو اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا۔

جس وقت وہ گاڑی سے اتر کر فراز کا بازو تھامے ہوئے الخضر کے گیٹ میں داخل ہوئی۔ سب سے پہلے نائلہ اور عاطف سے سامنا ہوا۔

وہ دونوں مہمانوں کے استقبال کے لیے گیٹ کے پاس ہی موجود تھے۔

"بس رابعہ......! اب تم اس گھر کے فرد کی حیثیت سے یہاں میرے پاس آ جاؤ۔" نائلہ نے کہا تو وہ ایک ادا سے بولی۔

"نہیں بھئی......! اس وقت میں صرف دولہا کی بہن ہوں۔"

اور فراز کے ساتھ ہی اندر چلی گئی۔ پھر سب مراحل بخوبی طے ہو گئے۔ نکاح اپنے وقت پر ہوا۔ اس کے بعد کھانا اور پھر ایک ایک کر کے مہمان رخصت ہونے لگے تھے۔

علی کو شاید نیند آ رہی تھی، اس لیے وہ رونے لگا تھا۔ وہ اسے لے کر صبیحہ کے کمرے میں آ گئی۔ خیال تھا اسے صبیحہ کے پاس چھوڑ کر خود آ جائے گی، لیکن علی، صبیحہ کے پاس جانے کو تیار ہی نہیں ہوا۔ مجبوراً وہ خود اس کے ساتھ لیٹ گئی اور جب اسے سلانے کے بعد باہر آئی تو تقریباً سب مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ بس انکل رحمٰن کی فیملی اور اس کے اپنے گھر والے ہی یعنی اماں ابا تھے اور وہ بھی جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

"علی سونے کے لیے تنگ کر رہا تھا، میں اسے سلانے چلی گئی تھی۔" وہ کسی کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اپنی غیر موجودگی کی وجہ بتانے لگی۔

"آؤں گی ابا......!" اس نے کہا پھر اماں اور بہنوں سے ملی۔

پھر صرف نائلہ رُک گئی تھی باقی سب چلے گئے۔ اس نے اور نائلہ نے مل کر کچھ پھیلا ہوا سامان سمیٹا پھر بے جی کے ٹوکنے پر کہ صبح سب ہو جائے گا۔ وہ نائلہ کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کپڑے تبدیل کر کے علی کے برابر لیٹی تو تھکن کا احساس ہونے لگا۔ دل چاہا چپ چاپ آنکھیں بند کر کے سو جائے، لیکن نائلہ شاید ابھی سونے کے موڈ میں نہیں تھی۔ لباس تبدیل کر کے اطمینان سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بالوں میں برش کر رہی تھی۔

"بس نائلہ......! اب سو جاؤ۔" اسے اُلجھن ہونے لگی۔

"اتنی جلدی......!" نائلہ برش رکھ کر اس کی طرف پلٹی۔

"بارہ بج رہے ہیں اور تم جلدی کہہ رہی ہو۔"

"صرف بارہ ہی تو بجے ہیں اور ابھی تو مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔" نائلہ بیٹھتے ہوئے بولی تو اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

''میں جانتی ہوں، تمہیں کون سی باتیں کرنا ہیں۔ اس لیے ان باتوں کو دہرا کر خواہ مخواہ اپنا وقت اور انرجی مت ضائع کرو۔''

''ٹھیک ہے، میں کوئی بات نہیں دہراتی، لیکن تمہارا جواب ضرور سنوں گی۔''

''کس بات کا جواب......؟'' وہ ایک دم آنکھوں سے بازو ہٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہائیں...... ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں معلوم ہے، میں کیا بات کرنا چاہ رہی ہوں......؟'' نائلہ نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں......! معلوم ہے، لیکن یہ نہیں معلوم کہ تم کس بات کا جواب سننا چاہتی ہو......؟''

اور نائلہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ فون کی بیل نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ رات کے سناٹے میں گھنٹی کی آواز دور تک سنائی دی تھی۔

''اس وقت کس کا فون ہوگا......؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''میرا خیال ہے، عاطف ہوں گے۔'' نائلہ اٹھتے ہوئے بولی، پھر جلدی میں کمرے سے نکل گئی اور وہ جو سونا چاہتی تھی، اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی، لیکن چند لمحوں بعد ہی نائلہ کی چیخ ہوئی پکار آئی۔

''بابا......! بے جی......!''

''الٰہی خیر......!'' وہ فوراً اٹھی اور تقریباً بھاگتی ہوئی باہر آئی۔

''بابا، بے جی اور احتشام بھائی بھی اپنے کمرے سے نکل رہے تھے۔ نائلہ بہت عجلت میں بتا رہی تھی۔

''پتا نہیں بابا، فراز کو کیا ہوا ہے، اسے آصف بھائی اپنے کلینک لے گئے ہیں۔''

''فراز......!'' وہ چیخی۔ ''کیا ہوا ہے میرے بھائی کو؟''

''آرام سے بیٹا......! آرام سے۔'' بابا نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

''مجھے بتائیں فراز کو کیا ہوا ہے، مجھے اس کے پاس لے چلیں۔'' وہ اپنے حواس کھونے لگی تھی۔ بس ایک خیال، کہیں وقت کا ظالم پنجہ......!''

''نہیں......'' وہ ہذیانی انداز سے چیخی۔ ''اللہ میاں جی......! میری برداشت سے بڑھ کر میری آزمائش مت کر، میں مر جاؤں گی۔''

''رابعہ......!'' اس طرح مت روؤ، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''احتشام بھائی نے جا کر گاڑی نکالی اور وہ سب جس طرح کھڑے تھے چل پڑے۔

اس کا دل سہم گیا تھا اور تمام راستہ، گزرے ماہ و سال کا ہر وہ پل جب وہ خوش ہوتی تو اچانک ہی کہیں سے وقت کا ظالم پنجہ اس کے سر پر آن کھڑا ہوتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں آسمایا۔

''کیا ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا......؟'' اس کے آنسو تواتر سے بہنے لگے۔

''نہیں...... اللہ میاں......! اگر فراز کو کچھ ہوا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔''

ڈاکٹر آصف کے کلینک میں انکل رحمٰن، آنٹی اور عاطف موجود تھے۔ ایک تو رات کا وقت تھا، دوسرے کلینک کا مخصوص خاموش اور پراسرار سا ماحول جس نے دل دہلا کر رکھ دیا۔

''کہاں ہے فراز......؟'' وہ آنٹی کے کندھے تھام کر بے صبری سے پوچھنے لگی۔

''جواب میں انہوں نے ایمرجنسی کی طرف اشارہ کیا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ پھر اچانک کیا ہوا اسے......؟''

''رابعہ......! تم پلیز یہاں بیٹھو۔'' نائلہ نے اسے بٹھا دیا تو وہ خالی خالی نظروں سے ایک ایک کی طرف دیکھنے لگی۔

انکل رحمٰن، بابا اور بے جی کو شاید فراز کے بارے میں بتا رہے تھے، آواز اس تک نہیں پہنچ رہی تھی، اس لیے وہ بغور انکل رحمٰن کے ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھنے لگی، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

وہ اُٹھنے کو تھی کہ کندھے پر دباؤ محسوس کر کے ادھر دیکھنے لگی۔ آنٹی اس کے پاس بیٹھیں پھر ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''یہ فراز نے تمہارے لیے دیا ہے۔''

''کب......؟''

''جب ہم الخضر سے لوٹے تو فراز نے یہ کہتے ہوئے دیا تھا کہ صبح رابعہ آئے گی، اسے دے دیجئے گا۔'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے کبھی ان کی طرف اور کبھی لفافے کی طرف دیکھنے لگی۔

''کھولو اسے۔'' نائلہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی تو وہ چونکی پھر لفافہ کھول کر اس میں سے کاغذ نکال لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ نائلہ نے بھی فراز کی تحریر میں نظریں جما دیں۔

''رابعہ......! مجھے معاف کر دینا میری بہن کہ میں تمہارے لیے کچھ نہ کر سکا۔ پہلے تمہیں اور امی کو بے آسرا چھوڑنے کا سزاوار ہوا گو کہ اس وقت میں بہت بڑا نہیں تھا پھر بھی امی سے بیٹے اور تم سے بھائی کا مان تو چھینا ہی، اور جب قدرت نے دوبارہ ہم دونوں کو ملایا تو میں نے سوچا تھا گزرے ماہ و سال کی تلافی کروں گا، لیکن میں شاید حالات کو شکست نہیں دے سکتا۔ میں تمہیں ڈھیر ساری خوشیاں دینا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ میں تمہیں اس زندگی سے نکال لاتا جو بے جی

نے تمہارا مقدر کردی ہے۔ اس کے لیے بظاہر آسان سا راستہ تو یہ تھا کہ میں کسی دن آ کر کہتا۔ اب میں آ گیا ہوں رابعہ میرے ساتھ جائے گی اور پھر ہم دونوں کہیں الگ اپنی دنیا بسا لیتے، لیکن ایک طرف تو میں احسانوں کے بوجھ تلے دبا تھا، دوسری طرف تم بھی بے جی کا گھر چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ بہر حال رضا کی برتھ ڈے میں تمہیں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میں نے سوچا تھا یہاں سے ہمارا راستہ آسان ہو جائے گا، لیکن اسی شب میری اور صبیحہ کی بات طے ہونے کے بعد جب تمہارا اور آصف بھائی کا ذکر آیا تو بے جی نے سختی سے اس موضوع کو ختم کر دینے کے لیے کہا۔ ان کا کہنا تھا تم حسام کی بیوی تھیں اور اب ہمیشہ اس کی بیوہ رہو گی۔ اس بات نے مجھے تکلیف پہنچائی اور میرا دل چاہا میں اسی وقت تمہیں وہاں سے نکال لے جاؤں، لیکن میں جانتا تھا تم اپنی محبتوں کا واسطہ دے کر مجھے روک لو گی اور تمہارے سامنے تو میں بے بس ہو جاتا ہوں، تمہاری کوئی بات رد کرنے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں اور پھر اس وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں بے جی کے دل پر ہاتھ رکھ دوں گا۔ اب تک وہ صرف ساس بن کر سوچتی آئی ہیں، جب ماں بن کر سوچیں گی تو شاید ان کے رویوں میں لچک پیدا ہو جائے۔

میں تمہاری خاطر رابعہ......! تم سے دُور جا رہا ہوں صرف تمہاری خاطر اپنی زندگی کا خاتمہ کرتے ہوئے صبیحہ کے سر پر بیوگی کی چادر اوڑھا رہا ہوں بے جی سے کہنا اگر منصف ہیں تو صبیحہ کے لیے بھی وہی راستہ منتخب کریں جو تمہارے لیے کیا تھا، ورنہ دوسری صورت میں تمہیں اپنے ہاتھوں ڈاکٹر آصف جہانگیر کے ساتھ رخصت کریں کہ زندگی میں یہی میری خواہش تھی۔

تمہارا فراز......"

"فراز......!" وہ پوری قوت سے چیخنا چاہتی تھی۔ لیکن آواز ساتھ چھوڑ گئی۔ دیوانگی کے عالم میں اٹھ کر اسی طرف بھاگی، جہاں ڈاکٹر آصف جہانگیر، فراز کو زندگی کی طرف لانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ ابھی کوریڈور میں ہی تھی کہ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر آصف باہر آتے نظر آئے۔

"ڈاکٹر آصف......!" وہ ان ہی کی طرف لپکی تھی کہ چکنے فرش پر پاؤں پھسل گیا اور گرنے کو تھی کہ انہوں نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

"فراز......!" ان کا سہارا غنیمت تھا، ورنہ وہ کسی طرح بھی خود سے کھڑے ہونے کے

قابل نہیں تھی۔

"وہ ٹھیک ہے اور آپ ہی کو دیکھنا چاہ رہا ہے۔" وہ ان کے بازو کا سہارا لیے ہوئے چل پڑی۔

فراز آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ وہ قریب پہنچی تو ڈاکٹر آصف کو چھوڑ کر اس کے سینے پر گر گئی۔

"تم مجھے چھوڑ کر جا رہے تھے۔" اس کے سینے میں منہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فراز نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ تھپکتے ہوئے اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا، لیکن اس کے آنسو کسی طرح تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

اسی وقت باقی سب لوگ بھی اندر آ گئے۔

"رابعہ......! یہ کیا کر رہی ہو......؟" نائلہ نے اسے اُٹھانا چاہا۔

"مجھے میرے بھائی سے الگ مت کرو۔" وہ نائلہ کے ہاتھ جھٹک کر بولی۔

"تمہیں تمہارے بھائی سے کوئی جدا نہیں کرے گا۔ لیکن اس وقت اسے آرام کی ضرورت ہے۔" بابا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو ڈاکٹر آصف خاموش نہ رہ سکے۔

"فراز سے زیادہ خود انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے میں انہیں نیند کا انجکشن لگا دیتا ہوں۔"

"نہیں......" وہ فوراً بولی۔ "میں نہیں سوؤں گی۔ میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر ہی وقت کا ظالم پنجہ......"

"رابعہ......!" فراز نے ٹوک دیا۔ "میں ٹھیک ہوں اور پلیز تم اس طرح مت روؤ، مجھے دُکھ ہوتا ہے۔"

"میرے رونے کا احساس ہوتا تو اس طرح کیوں کرتے......؟"

"میرا خیال ہے رابعہ......! بعد میں آپ اس کی اچھی خاصی خبر لیجیے گا۔ اس وقت اسے آرام کرنے دیں۔"

"آپ سب بھی خاصے بے آرام ہو چکے اور اب ویسے بھی یہ ٹھیک ہے اور کچھ دیر میں سو بھی جائے گا، اس لیے......"

ڈاکٹر آصف خاموش ہو گئے۔ ان کا خیال تھا، سب ان کا اشارا سمجھ گئے ہوں گے۔

"میں اس کے پاس ہی رکوں گی۔" اس کے کہنے پر بے جی آگے بڑھ آئیں۔

"بیٹا......! تم گھر جاؤ۔ میں ہوں اس کے پاس۔" وہ فراز کی طرف دیکھنے لگی تو اس نے سر

ہلا کر تائید کی۔

''بس تو بے جی اور آنٹی یہیں رکیں گی، باقی سب چلتے ہیں۔''

''او کے فراز......!'' سب باری باری فراز سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گئے......وہ کھڑی ہوئی تو بے جی کہنے لگیں۔

''آصف......! مجھے رابعہ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی، تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔''

اس کے بڑھتے قدم رُک گئے اور فوراً پلٹ کر بے جی کی طرف دیکھنے لگی تو انہوں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔

''ڈاکٹر آصف تمہیں گھر چھوڑ دیں گے اور پھر تمہیں ان کے ساتھ تو جانا ہی ہے۔''

وہ نظروں کا زاویہ بدل کر فراز کی طرف دیکھنے لگی۔ جو احساسِ طمانیت میں گھر کر آنکھیں بند کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔

''چلیے......!'' عقب سے ڈاکٹر آصف کی آواز آئی تو وہ بے جی کا اشارہ پا کر دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے ساتھ چل پڑی۔

کوریڈور کی حد ختم ہوتے ہی انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بری طرح نروس ہو گئی۔ ان کا ہاتھ ہٹانا چاہتی تھی کہ انہوں نے اس کا ہاتھ بھی گرفت میں لے لیا۔

''بہت شوق ہے تنہا چلنے کا......'' وہ بولنے کے قابل نہیں رہی تھی، ویسے بھی اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''سنو......!'' وہ قدم روک کر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ''اب یہاں سے آگے اسی وقت جائیں گے جب تم باقی ماندہ حیات کے سفر کے لئے مجھے اپنی ہمراہی کا یقین بخشو گی۔ فقط ایک مسکراہٹ سے......''

''ڈاکٹر آصف......!''

''اوں ہوں......! فقط ایک مسکراہٹ......'' اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو ان کی طرف دیکھنے پر آمادہ کیا۔ وہ بڑی دلکش مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر رنگوں کی برسات اُترنے لگی۔ جنہیں اس نے خود بھی محسوس کیا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ برسات ہو اور کلیاں نہ چٹکیں رنگوں کی، محبتوں اور چاہتوں کی برسات نے اس کے دل کی بنجر زمین کو سیراب کرنا شروع کیا تو مدھم سی مسکراہٹ آپ ہی آپ ہونٹوں پر اُتر آئی۔

''گڈ......!'' ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور وہ ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر چل پڑے۔

بہت زیادہ دن نہیں گزرے تھے، جب دور تک پھیلے آسمان کے سینے پر جگمگاتے ستارے

اسے اپنا مذاق اُڑانے لگے تھے۔ تم جھوٹی ہو اور اب جبکہ وہ ان کی سنگت میں کچ کچ قدم اُٹھا رہی تھی تو وہی ستارے اسے اپنے راستوں میں بکھرے نظر آئے۔ ہر قدم جگمگاتے ہوئے اور اسے مبارک باد دیتے ہوئے جیسے آسمان سے ٹوٹ ٹوٹ کر چلے آ رہے تھے اور اب تو اسے مسکراتا ہی تھا۔ کیونکہ اپنی خاموشیوں، صبر اور ثابت قدمی کے جو بیج اس نے بوئے تھے۔ ان کی فصل گلوں کی صورت تیار تھی۔ تھوڑا انتظار تو کرنا پڑا، لیکن اب وہ آصف جہانگیر کے سنگ ہی اسے کاٹنے جا رہی تھی جو اس نے بویا تھا۔

○ ○ ○